بسم اللہ الرحمن الرحیم
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
محمد عمر حیات الحسینی
انسان
اور
مسئلہ تقدیر
ناشر
حضرت ملا امام بوسن ٹرسٹ اڈا بند بوسن ملتان

جامعہ اسلامیہ اشاعت القرآن مرکزی جامع مسجد حضرت
مفتی عبدالحکیمؒ میں باقاعدہ درسِ نظامی کے شروع ہونے پر
اور حضرت مفتی عبدالحکیم صاحبؒ اسلامک ریسرچ
انسٹی ٹیوٹ
کے تحت "فتاویٰ حکیمیہ" کے مرتب ہونے کی خوشخبری پر
جامعہ کے ناظم اعلیٰ صاحبزادہ قاضی عبدالرشید صاحب کو
ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

محمد عمر حیات الحسینی

انسان اور مسئلہ تقدیر

حضرت علامہ امام بوسن ٹرسٹ اڈا بند بوسن ملتان

نام کتاب — انسان اور مسئلہ تقدیر
نام مصنف — محمد عمر حیات الحسینی
تاریخ طباعت — ۱۹۹۳ء
پرنٹرز:- خاور پرنٹرز میاں محمد روڈ میرپور آزاد کشمیر

(کلمات تشکر)

بندہ ناچیز اور میرے جملہ ساتھی محترم غلام رسول صاحب (عوامی گفٹ سنٹر ولایت سنٹر میرپور آزاد کشمیر) کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اپنی دین دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے۔ کتاب ھذا کی طباعت کرادی خالق ارض وسماں کو اور ان کے خانوادہ کو ہر دکھ۔ مصیبت پریشانی دنیا و آخرت میں نجات عطا فرمائے۔ امین

گنبد خضری کی ہریالی کا صدقہ ان کے اخلاص و تقویٰ اور رزق حلال میں برکتیں نصیب ہوں اور ساتھ محترم قاری محمد یونس صاحب مدرس جامعہ اسلامیہ اشاعت القرآن مرکزی جامع مسجد حضرت مفتی عبدالحکیم میرپور آزاد کشمیر کا بھی ممنون ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمل اور رزق حلال میں مزید برکتیں عطا فرمائے امین۔

دعا گو
گدائے درحبیب
الحسینی غفرلہ

فہرست

صفحہ

اس حقیر کاوش کو

(تحریک منہاج القرآن کے روحانی پیشوا، و سرپرست)

قدوۃ الاولیاء، مرشدنا و سیدنا حضرت طاہر علاؤ الدین القادری الگیلانی البغدادی قدس سرہ العزیز کے نام گرامی منسوب کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں کہ جن کا روحانی فیض تحریک منہاج القرآن کی صورت میں پوری دنیا میں جاری و ساری ہے۔ حضرت کی نظر کرم کا یہ فیضان ہے کہ میرے جیسے سیاہکار اور بے علم و بے عمل انسان سے بھی یہ ٹوٹا پھوٹا کام لیا جا رہا ہے۔ خالق ارض و سما بزرگان دین کے اخلاص ا تقویٰ کی ہم سب کو وافر خیرات عطا فرمائے آمین۔ اللہ تعالیٰ جل مجدہ حضرت قبلہ سیدی و سندی کے خانوادہ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

اور اللہ تعالیٰ شہزادگان والد عالی مرتبت

* حضرت صاحبزادہ سیدی محمود محی الدین الگیلانی القادری
* حضرت صاحبزادہ سیدی عبد القادر جمال الدین الگیلانی القادری
* حضرت صاحبزادہ سید ضیاء الدین الگیلانی القادی

دامت برکاتہم العالیہ

کو فیضان غوثیہ سے مالا مال فرمائے اور ہر دکھ و رنج سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

"آباد خدا رکھے میخانہ محمد کا"

اللہ تعالیٰ ان کو معاندین، حاسدین، کے شر و فتنہ سے محفوظ رکھے (آمین)

گدائے در حبیب
محمد عمر حیات الحسینی
خادم حضرت مفتی عبد الحکیم اسلامک ریسرچ
انسٹی ٹیوٹ مرکزی جامع مسجد میرپور آزاد کشمیر
فون: ۰۵۴۲-۲۵۷۰

پیر طریقت رہبر شریعت حضرت پیر سید غلام رسول شاہ صاحب خاکی
دامت برکاتہم العالیہ (آستانہ عالیہ قادریہ مخدومیہ مرید چکوال)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم اما بعد

مسئلہ تقدیر ایمانیات کے سلسلے کا ایک اہم ترین موضوع ہے۔ جو اجزائے ایمان کا آخری، مگر نہایت مہتم بالشان جزو ہے۔ لیکن عجیب اتفاق کی بات ہے۔ کہ اس مسئلہ کی نسبت لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات اور اوہام و وساوس پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موضوع پر کرید کرید کر گفتگو کرنے سے منع فرمایا ہے۔ کیونکہ اس پر حد سے زیادہ بحث و تمحیث کرنے کا نتیجہ گمراہی ہے۔ لہٰذا ایسے پیچیدہ اور نازک مسئلہ کو سلف صالحین نے راز الٰہی سے تعبیر کیا ہے اور راز کو بے جا منکشف کرنا درست نہیں ہے۔ اس مسئلہ کی حقیقت فقط الامر بین الامرین / بین القدر و الجبر ہے۔ اس کے کسی ایک پہلو پر غلبہ گمراہی کے سواء کچھ نہیں۔ اہل سنت کا یہی عقیدہ قرآن و سنت کی روح ہے۔

عزیزم محمد عمر حیات الحسینی سلمہ، میرے پیارے عزیز ہیں۔ ان کو اپنے شیخ طریقت قدوۃ الصالحین حضرت سیدنا طاہر علاؤ الدین القادری الگیلانی البغدادی قدس سرہ العزیز کی ذات سے بے پناہ محبت و عقیدت کی نعمت حاصل ہے۔ اور ایسے مردان باصفا خلیل صفت صوفیاء کی محبت قل یانار کونی بردا و سلاما علی ابراہیم کے مصداق تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن کی نعمت نصیب ہوتی ہے اور یہی نعمت شرح صدر کا سبب ہے۔ اور ایسے کامل صوفی کی نظر کے ساتھ ساتھ شیخ الاسلام حضرت علامہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب جیسی ذہین و فطین شخصیت سے شرف تلمذ سے عزیزم میں حسین امتزاج پیدا ہوا ہے۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کی دین ہے جسے چاہے ایسی لازوال نعمتوں سے نواز دے۔ کتاب ہذا "مسئلہ تقدیر اور انسان" کا مسودہ دیکھا اور عزیزم کی زبانی سنا۔ جو اپنے موضوع پر بے مثال تحقیقی مقالہ ہے۔ انشاء اللہ اس مسئلہ کی نسبت لوگوں کے جملہ شکوک و شبہات کا ازالہ ہوگا۔

غلام بن کر اس کی رضا کے حصول میں غلامی کے تقاضے پورے کریں۔

ہماری ظاہری و باطنی تمام تر عبادات کا مقصود و مدعا مالک حقیقی سے قربت ہو اجرت نہ ہو اور ہماری منزل دوزخ سے بچنا یا جنت کا حصول نہ ہو بلکہ مالک کو خوش دیکھنا

جنت میں مجھے بھیج یا دوزخ میں ڈال دے
پر جلوہ دکھا کے میری حسرت نکال دے

جب ہمارا مالک ہم سے خوش ہو جائے گا تو جنت بھی مالک کی طرف سے ایک انعام ہے یہ بھی مل جائے گا

واعظ ! کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے
سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

بندہ عرض کر چکا ہے کہ تقدیر کو سمجھنے سے پہلے قادر کو سمجھنا ضروری ہے کائنات میں جو کچھ موجود ہے یہ قادر مطلق کی قدرت کا ظہور ہے حضرت مولا علیؑ فرماتے ہیں کہ کارخانہ قدرت میں فکر کرنا بھی عبادت ہے کارخانہ قدرت میں جتنے بھی مظاہر ہیں یہ قادر مطلق ذات کا پتہ بتا رہے ہیں حدیث قدسی ہے

کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق میں ایک گنج مخفی تھا چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں پس میں نے خلقت کو پیدا فرمادیا اسی تخلیق میں خالق کی پہچان ہے

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

تمام تخلیق میں برتر و بالا حضرت انسان ہے یہ انسان کو ہی اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل ہے انسان کامل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے جب انسان زندگی کے تمام معاملات میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کرتے ہوئے اپنی خواہشات کی نفی کر دیتا ہے اور حقوق اللہ و حقوق العباد ادا کرتے وقت ذات کے حفظ مراتب کا پاس کرتے ہوئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی میں حسن کائنات میں کھو جاتا ہے تو اسے ہر سمت حسن حقیقی کے جلوے نظر آنے لگتے

ہیں جب انسان اپنی خواہشات کی نفی کرتے ہوئے ذات حق کا اثبات کر لیتا ہے تو اسے راضی برضا کا مقام حاصل ہو جاتا ہے اور پھر بقول اقبال:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

جزاء و سزا کا تعلق کسب و ارتکاب سے ہے خلق سے نہیں کسب انسانی فعل ہے اور خلق اللہ تعالیٰ کا "جبر و قدر کے بارے میں صحیح موقف یہی ہے الامر بین الامرین"
امور تکوینیہ اور امور تشریعیہ کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے:
قادر و قیوم ذات ہمیں اپنی معرفت کاملہ عطا فرمائے آمین ۔ اور اپنی ذات کے مظہر کامل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی اور محبت جو آپ کی اتباع میں مضمر ہے نصیب فرمائے آمین ۔ اور عزیزم حسینی صاحب سلمہ کی اس کاوش کو منظور و مقبول فرماتے ہوئے ان کے اخلاص و تقویٰ، علم و عمل اور جذبہ خدمت دین میں مزید وسعت فرمائے آمین ثم آمین یارب العالمین

بندہ عاجز
سید شاہد حسین کاظمی
(سجادہ نشین آستانہ عالیہ کاظمیہ سہروردیہ محمد پورہ)

1/4/94

مفکر اسلام عمدۃ المحققین حضرت علامہ پروفیسر سید عبدالرحمن صاحب بخاری
دامت برکاتہم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد رب العلمین و الصلوۃ و السلام علی حبیبہ سیدنا مولانا محمد و علی الہ و صحبہ اجمعین اما بعد

ایک سوال جو کائنات کی سب سے پیچیدہ گتھی بن چکا ہے اور جس نے تاریخ اسلام ہی نہیں بلکہ تاریخ عالم کے سب سے شدید اور طویل نزاع کو جنم دیا تقدیر کا سوال ہے جب سے انسان کے دل نے دھڑکنا اور دماغ نے سوچنا شروع کیا یہ سوال ایک معما بن کر سامنے کھڑا ہو گیا کہ زندگی اختیار مطلق کا آئینہ ہے یا جبر مسلسل کا المیہ عقل کی دانش آموزی سے لیکر وجدان کی دروں بینی تک شعر کی لطافت آمیزی سے لیکر سائنس کی حسی تجربیت تک اور فلسفہ کی حکمت پیرائی سے لیکر مذہب کی ماورایت تک سبھی جبر و اختیار کی اس گتھی کو

سلجھانے میں مصروف ہیں دراصل ,تقدیر کا یہ سوال خود مسئلہ حیات ہی کی تفریع ہے جب تک یہ آشکار نہ ہو کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے تقدیر کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا ور انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ آج تک زندگی کی حقیقت دریافت نہیں کر سکا بقول اقبال؟

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

زندگی کی مجرو حقیقت سے انقاب کشائی کے بارے میں فلسفہ کی تمام تر خیال آرائی شاعری کی ندرت آفرینی اور سائنس کی مادیت افروزی سے قطع نظر عملاً انسانی زندگی دو متفرق اور جداگانہ نظریہ ہائے زیست کی اساس پر رواں دواں ہے ایک متشائم pessimism اور دوسرا متفاول opti mism افلاطون کے "فلسفہ نفی حقیقت" سے لیکر اپنشدھ کی ویاس تعلیم بدھ مت کے تصور نروان یورپ کے نظریہ وجودیت Existentialism اور عیسائی نظام رہبانیت، تک سبھی متشائم نظریہ حیات Pessimist theory of life پر استوار ہیں یہ نظریہ کائنات کو صرف ایک سراب زندگی کو فریب اور وجود کو عذاب ٹھہرا کر انسان کو جبر محض اور یاس وقنوط کی گرفت میں دے دیتا ہے اس سے انسان کی سعی و کاوش اور حرکات و عمل کے، سب عناصر مفلوج ہو جاتے ہیں اور وہ جبر حیات کے اثر سے چھٹکارا پانے کے لئے رہبانیت ترک دنیا اور تقشف کی ویران گھاٹیوں میں اتر جاتا ہے

اسلام دین فطرت ہونے کے ناطے متفاول نظریہ حیات Optimist theory of life کا علمبردار ہے یہ انسان کو احساس نفس اور شعور ذات سے آراستہ کرتا ہے اسکی رو سے زندگی خدا کی عظیم نعمت اور مقدس امانت ہے اسکے ممکنات potentials لا متناہی، مقصد قوائے عالم کی تسخیر اور دائرہ عمل آفاق کی سب وسعتوں پر محیط ہے یہ نظریہ انسان کو قنوطیت کے گرداب سے نکال کر رجائیت کے ساحل مراد پہ پہنچا دیتا ہے یوں انسان میں

متاعِ حیات کی قدروقیمت کا احساس ابھرتا ہے اور اسکی جدوجہد کے دائرے میں کائنات کی لامتناہی وسعتیں اور زندگی کے تمام گوشے سمٹ آتے ہیں اور یہی وہ معنوی تناظر ہے جس میں انسانی حریت و اختیار کی حدود متعین ہوتی اور اسلامی نظریہ جبرو قدر کی فکری بنیادیں فراہم ہوتی ہیں

اسلامی فکر کی تاریخ میں مسئلہ جبروقدر کو مختلف حوالوں اور متنوع جہتوں سے اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی علم ازلی اور علم واقعی کا امتیاز ہو کہ خلق عمل اور کسب فعل میں تفریق جبروقدر میں کسی ایک جہت کا غلبہ ہو کہ توازن و آمیزش کا نظریہ سبھی مسئلہ تقدیر کے حل کی مختلف تعبیریں ہیں ان تعبیروں پر بحث و نظر کے سلسلے جس قدر پھیلتے گئے مسئلہ قضاء و قدر اتنا ہی الجھتا چلا گیا بہر آئنیہ بات مدارج علم کی ہو یا خلق و کسب کے امتیاز کی جبروقدر میں آمیزش کی ہو یا کسی ایک جہت کے غلبہ کی اصل حقیقت یہ ہے کہ علم خالق فعل انسان کا موجب نہیں خلق عمل کسب عبد کا ثمر ہے خبر کا آئنیہ جبر نہیں اور قدرو جبر میں ایک گونہ تلازم ہے

بناء بریں اسلام کی رو سے تقدیر کا مفہوم یہ ہے کہ انسانی وجود میں نشوو ارتقاء کے رویوں اور فکرو عمل کے لامتناہی ممکنات ودیعت ہیں وہ عقل وادراک، جذبہ و احساس اور ارادہ و اختیار کی بے پایاں قوتوں سے آراستہ ہے ادراک احساس اور ارادہ ہی وہ قوتیں ہیں جو وسیع و عریض کائنات اور متنوع مخلوقات میں انسانی تفردو امتیاز اور شرف و عظمت کی بنیاد مہیا کرتی ہیں اور انہیں پر حیات انسانی کی ابتلاء و آزمائش اور مسئولیت و جواب دہی کا سارا نظام استوار ہے یہ دنیا دارالاسباب ہے اور زندگی سراسر ابتلاء اس لئے حکمت ربانی نے دنیا کے ہر واقعہ زندگی کے ہر معاملے اور انسان کے ہر عمل کو سبب و مسبب کے حسی رابطے میں جکڑ دیا ہے انسان زندگی کے ہر گوشے اور ہر معاملے میں اپنے قوائے نفس اور ممکنات عمل سے اسباب کا تانا بانا تیار کرتا ہے اور مشیت الٰہی کا قانون مکافات ان اسباب کے نتائج و ثمرات مرتب کرتا چلا جاتا ہے اسباب کا تعلق انسان کے کسب و اختیار سے ہے اور مسببات و نتائج کا ظہور مشیت الٰہی کے تابع یوں اسباب و اعمال کی سطح پر انسانی حریت و اختیار کا ظہور ہوتا ہے اور اسباب کے درجے میں جبر مشیت کی نمود اور اسی جبرو اختیار کی آمیزش سے اسلام کا تصور قضاء و قدر ابھرتا ہے

یہاں اس امر کی تصریح لازم ہے کہ اعمال کے نتائج و ثمرات کا ظہور اگرچہ
مشیت الٰہی پر موقوف ہے لیکن اعمال اور نتائج کے مابین رابطہ سببیت کی کار فرمائی اعمال
کی طرح نتائج کی ذمہ داری بھی انسان کو ہی ٹھہراتی ہے اعمال و افعال کی طرح واقعات
کے اسباب و عوامل میں عام طور پر انسان ارادہ و اختیار ہی سے جنم لیتے ہیں او مسببات و
نتائج کا ظہور انہی اسباب و عوامل پر موقوف ہوتا ہے اور انہی کی طرف منسوب،
اس لئے انسان ہی ان مسببات و نتائج کا ذمہ دار قرار پاتا ہے یہی دنیوی
مسئولیت اور اخروی جواب دہی کی بنیاد ہے یہی انسانی حریت و اختیار کا دائرہ ہے اور یہی
مکافات عمل کا قانون مسئلہ تقدیر کے اس پہلو سے صرف نظر کر لیا جائے تو سارا نظام
تخلیق اور پورا کارخانہ قدرت ایک لاینحل معما بن کر رہ جاتا ہے

تقدیر کی گتھی سلجھانے میں انسانی فکر و شعور اور ادراک و بیان کی حدود معین اور
ابعاد Dimensions واضح ہیں اسلام نے انہیں معین حدود و ابعاد میں رہتے ہوئے مسئلہ
تقدیر پر غور و فکر کی اجازت دی ہے اور اسی غور و فکر کا ایک حسین پیرایہ زیر نظر تصنیف ہے
فاضل نوجوان محترم محمد عمر حیات الحسینی صاحب حفظ اللہ کی شخصیت میں جدید و قدیم علوم
کا حسین امتزاج نمایاں ہے کم عمری ہی میں ان کی متعدد تالیفات منصہ شہود پر آچکی ہیں
پیش نظر کتاب انسان اور مسئلہ تقدیر ان کی وسعت مطالعہ عمیق غور و فکر اور علمی وثوق و
استناد پر شاہد ہے یہ تقدیر کے پیچیدہ مسئلہ کو اسکے تمام تر تاریخی پس منظر اسلام کے
تہذیبی ارتقاء اور عصر جدید کے فکری شعور کے وسیع تر تناظر میں رکھ کر حل کرنے کی ایک
نادر کوشش ہے مجھے اس کتاب کے آئینے میں فاضل کے درخشاں علمی مستقبل کی جھلک نظر
آرہی ہے رب قدوس اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ سلم کے نعلین پاک کے صدقے
ان کی اس کاوش کو شرف قبولیت سے نوازے اور ان کے لئے ذخیرہ حسنات بنائے آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ و صحبہ اجمعین

والسلام

گدائے در حبیب ؐ

سید عبدالرحمن بخاری

ریسرچ آفیسر قائداعظم لائبریری لاہور

22 اپریل 1994 جمعہ

رئیس المدرسین اُستاذ العلما حضرت العلامہ مفتی محمد غلام اصغر صاحب سیالوی دامت برکاتہم العالیہ

مفتی و شیخ الحدیث مدرسہ عربیہ محمدیہ مہرویہ قمرالاسلام بستی بوسن ہٹھاڑ۔ملتان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ الذی ارتضی حبیبہ فی الارض والسما الصلوۃ والسلام علی سیدنا وسیدالرسل وسیدالانبیاء وعلی آلہ الاتقیا واصحابہ الصفیاء اما بعد

رسالہ ھذا "انسانی زندگی میں قضاو قدر کا کردار اور مسلک اعتدال"

میں نے پوری طرح دیکھا ھے جو اپنے موضوع پر بے مثال و بے نظیر ھے۔ ممکنہ شکوک و شبہات کو رفع کرنے کے لیئے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

اور قرآن وسنت کے دلائل و براھین سے اہل سنت کے موقف یعنی راہ اعتدال کو بالکل واضح کردیا ھے۔

عزیزم محمد عمر حیات الحسینی صاحب زید مجدہ نے محنت شاقہ اور عرق ریزی کے ساتھ اسے مرتب فرمایا ہے۔

کیونکہ موضوع لاینحل ہے۔ جس کو جتنا پھیلایا جائے اُسی قدر پھیلتا جاتا ہے اور ساتھ شکوک و شبہات بھی پیدا ہوتے جاتے ہیں بعض کم علم و فہم لوگ مسئلہ تقدیر پر بڑی جرات و دلیری کے ساتھ بحث مباحثہ کرتے ہیں جس سے ایمان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے

رسول اکرم، نبی معظم، والی دو جہاں، خسرو خوباں سیاح لامکان

عزیز مصر صمدیت

ملک مملکت احدیت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سخت ممانعت فرمائی ہے۔

کہ اس موضوع پر بحث مباحثہ نہ کیا جائے کیونکہ بحث مباحثہ کرنے والے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں

جہلا اور کم علم لوگوں کے ممکنہ اشکالات وخدشات کو رفع کردیا ہے

عقل سلیم رکھنے والوں کے لئے وافر مقدار میں مواد جمع کر دیا گیا ہے۔
اللہ تعالیٰ بصدقہ گنبد خضری کے مکین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توجہات سے عزیزم محمد عمر حیات الحسینی صاحب سلمہ کو عمر خضری عنایت فرمائے۔ آمین ثم آمین اور اس تحریر کو ہم سب کے لئے نجات اخروی کا سبب بنائے آمین ثم آمین۔ اور عزیز محترم کے جملہ مقاصد خیر کو پورا فرمائے آمین

فقط
عبدہ المذنب محمد غلام اصغر سیالوی۔
۲۱/۱۲/۹۳
(مفتی و شیخ الحدیث مدرسہ عربیہ محمدیہ مہرویہ قمرالاسلام بوسن ہٹھاڑ، ملتان)

شیخ الحدیث و التفسیر حضرت العلامہ مولینا عبدالمالک صاحب مدظلہ العالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا محمد عمر حیات الحسینی ان نوجوانوں میں سے ہیں جنہیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے علمی تحقیق کے جوش و جذبہ اور صلاحیت سے نوازا ہے کئی موضوعات پر داد تحقیق لے چکے ہیں ان کا تازہ مقالہ قدیم معرکتہ الاراء اور مشکل ترین مسئلہ جبر و قدر کے متعلق ہے موصوف نے اس کا آغاز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد مبارک سب کچھ پہلے سے متعین اور فیصل شدہ ہے سے کیا آپ کا یہی ارشاد تو اس مسئلہ کا نچوڑ ہے مسئلہ گہرائی تک پہنچنے کیلئے یہی ارشاد کلیدی حیثیت رکھتا ہے اسی آغاز سے کتاب پرکشش ہو گئی ہے اور اسکی قدر و منزلت میں اضافہ ہو گیا ہے مقالہ کے عنوانات پر نظر ڈالنے سے کتاب کی جامعیت سامنے آجاتی ہے اللہ تعالیٰ مصنف کی علمی صلاحیتوں میں اضافہ فرمائے اور اسکی مساعی جلیلہ کو شرف قبولیت سے نوازے آمین

عاجز
عبدالمالک
(ناظم اعلیٰ و رابطۃ المدارس الاسلامیہ پاکستان و شیخ الحدیث)
مرکز علوم اسلامیہ منصورہ لاہور

محترم جسٹس ملک غلام علی صاحب

(سابق جج و مشیر وفاقی شرعی عدالت پاکستان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم امابعد

مسئلہ تقدیر فی الواقع ایک نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس پر احتیاط کا دامن تھامنا انتہائی ضروری ہے کیونکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے ہم راز الٰہی سے تعبیر کر سکتے ہیں بندہ نے عزیز محترم محمد عمر حیات الحسینی سے مسئلہ تقدیر کے مسودہ کے بعض مقامات کو سنا اور مجھے یہ بات کہتے ہوئے اور لکھتے ہوئے کوئی تامل نہیں ہے کہ یہ کوشش انشاللہ سود مند اور موجب افادیت ہوگی میں دعاگو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمل میں مزید برکت عطا فرمائے راہ حق پر استقامت بخشے اور ان مسائل پر ریسرچ اور تحقیق کی توفیق عطا فرمائے جن کی فی الواقع ضرورت ہے۔

راقم عاجز

والسلام

غلام علی

ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور

پیش لفظ

مسئلہ تقدیر ایمانیات کے سلسلے کا ایک اہم ترین موضوع ہے لیکن عجیب اتفاق ہے اس مسئلہ کی نسبت لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات اور اوہام و وساوس پائے جاتے ہیں۔

اس پر کرید کرید کر گفتگو کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے کیونکہ ایسے پیچیدہ اور نازک مسائل میں الجھنے سے سوائے بے عملی کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ انسانی عقل و دانش اس نازک مسئلے کے حقیقی مضمرات کا احاطہ بھی نہیں کر سکتی۔ اس موضوع پر حد سے زیادہ بحث و تمحیص کرنے کا نتیجہ گمراہی ہے اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کرید کرید کر گفتگو کرنے سے منع فرما دیا۔

اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کے "مجبور یا مختار" ہونے کے مسئلہ پر تاریخ میں فلاسفہ، مفکرین کے نزدیک بہت اختلاف رہا ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق افراط و تفریط کی رائے رکھی جاتی رہی ہے ، جس کی وجہ سے اس مسئلے کے اثرات نے خواص سے لے کر عوام تک کے ذہنوں کو متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے ۔

اس مسئلہ کے متعلق عاجز سے مختلف مقامات کے (چکوال ، پنڈی ، اٹک ، پشاور ، نوشہرہ ، کسووال ، بہاولپور ، ملتان) دوستوں نے استفسار کیا جس کا جواب دیا گیا جن سے ان کے شکوک و شبہات کا ازالہ ہوا ۔

کسووال میں دورانِ خطابت جمعۃ المبارک کے بعد سوال و جواب کی نشست میں بھی اس کے متعلق سوالات کئے گئے ۔ انہی سوالات کے پیش نظر شب برات پر مسئلہ جبر و قدر کے موضوع پر تقریر کا اعلان کیا گیا تاکہ لوگوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا جا سکے ۔ اس موضوع کے متعلق اشتہار میں بھی دے دیا گیا تھا کیونکہ جمعۃ المبارک کی ایک نشست میں اس موضوع پر گفتگو کی گئی اور بقیہ گفتگو شب برات پر کرنے کا اعلان کر دیا گیا تھا ۔ لوگوں نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا لیکن عین موقع پر اس گفتگو کو ملتوی کرنے کا احباب نے فیصلہ دیا کیونکہ موضوع علمی ہے جو تشنہ رہنے کی وجہ سے مزید شکوک و شبہات پیدا کرنے کا سبب بن جائے گا ۔

بہرحال عاجز نے اس موضوع کے نوٹس وغیرہ تیار کر کے جمعۃ المبارک کی دو تین نشستوں پر بیان کر دیا تھا ۔ اس کے بعد بہاولپور اسلامیہ یونیورسٹی کے دوستوں کے اصرار پر اس مسئلے کے متعلق سوال و جواب کی نشست رکھی گئی تھی جس کا دورانیہ رات سات بجے تا ۱۰۳۰ بجے یعنی ساڑھے پانچ گھنٹے رہا تھا ۔

لہذا ان اسباب کی بناء پر خوب مطالعہ کرنے کا موقع ملا ۔ اس موضوع پر مفکرِ اسلام حضرت العلامہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے خطبات سے استفادہ کیا گیا جو اس موضوع پر نہایت اہم ترین ہیں ۔ آپ کے علمی مقام اور اندازِ خطابت کو تو اپنے اور بیگانے دونوں تسلیم کرتے ہیں ۔ علم و تحقیق اور دینی و سیاسی خدمات کے حوالے سے بھی آپ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں اور اس موضوع پر شیخ

الحدیث حضرت قبلہ سید محمد زبیر شاہ صاحب دامت برکاتہم العالیہ چکوال نے (دوران دورہ تفسیر) بھی بڑی علمی بحث فرمائی تھی جو قرآن مجید:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ ۔ الخ ۔

کے ماتحت کی گئی تھی ۔ حضرت قبلہ شیخ الحدیث دامت برکاتہم العالیہ کا شمار قابل ترین مدرسین میں ہوتا ہے جن کا انداز تدریس اپنی مثال آپ ہے ۔ آپ نے منطقی مثالوں کے ذریعے خوب مسئلہ سمجھایا ۔ (دورہ تفسیر کے نوٹس) وغیرہ تیار کئے تھے ۔ جن سے عاجز نے حسب ضرورت استفادہ کیا ۔

مسئلہ تقدیر پر عوام الناس میں انتہائی شکوک و شبہات پائے جا رہے ہیں جو روزمرہ مسائل میں سننے میں آتے رہتے ہیں جن کا حقیقت کے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا کیونکہ عوام الناس کی غالب اکثریت تصورِ تقدیر و سمجھ نہیں سکی ۔

لہذا بہتر سمجھا کہ عوام کے ذہنی شکوک و شبہات کے ازالہ کے لئے اسے کتابی شکل دے دی جائے ۔ اس کا دوسرا حصہ تو خاندانی منصوبہ بندی ہے جس کا مسئلہ تقدیر کے ساتھ گہرا ربط ہے ۔ اس سے بھی مزید شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جائے گا مسئلہ سمجھ کر عمل کرنے والوں کے لئے تو اس میں وافر مواد ہے ۔ لیکن اس مسئلے کو الجھنے اور الجھانے والوں کے لئے تو عمل سے بچنے کے لئے خواہ مخواہ حیلہ جوئی اور بہانہ تراشی ہوگی ۔

سزا سے بچنے کے لئے تو بہت زیادہ حیلے تراشے جاسکتے ہیں لیکن یہ اپنے آپ کو دھوکہ دہی کے سواء کچھ نہ ہوگا ۔ اس لئے قارئین سے میری درخواست ہے کہ اس کتابچہ کو بار بار پڑھیں کیونکہ ہر بار پڑھنے سے مسئلہ کو سمجھنے اور ذہنی شکوک و شبہات کو دور کرنے میں آسانی ہوگی ۔

اللہ رب العزت بصدقہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عاجز کی اس کاوش کو ذریعہ نجات فرمائے آمین ۔ اور قارئین کو استفادہ کر کے عمل کرنے کی مزید توفیق عطا فرمائے ۔

فی الحقیقت یہی بات غلط ہے کہ علم الٰہی کی وجہ سے کہ عامل و فاعل کا ارادہ و اختیار سلب و مفقود ہو جاتا ہے۔ علم الٰہی ازلی انسان کے ارادہ و اختیار کو سلب نہیں کرتا بلکہ اس کو اور ثابت اور مستحکم کرتا ہے۔

اللہ رب العزت کو تمام کائنات کے پیدا کرنے سے پہلے اس کا علم تھا اسی علم کو تقدیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس طرح ایک انجینئر ایک ڈیم بنانے سے پہلے اس کی تمام جزئیات پر غور کرتا ہے اس کے میٹریل Material کی صلاحیت و استعداد اور طاقت و قوت کا جائزہ لیتا ہے۔ ڈیم بنانے سے پہلے اس کا ایک نقشہ تیار کرتا ہے۔ پھر اس کی تیاری سے پہلے اس میٹریل کی طاقت و قوت کے بل بوتے پر اس کی کارکردگی کی عمر کا اندازہ قائم کر کے پیش گوئی کر دیتا ہے کہ مثلاً ڈیم سو سال تک کارآمد رہ سکتا ہے یا جیسے مختلف مشینیں بنانے والے گارنٹی دیتے ہیں کہ یہ مشین اتنے عرصے تک بغیر کسی نقص کے کام کرتی رہے گی لیکن انجینئر اور دوسرے فنکار حضرات چونکہ ناقص علم رکھتے ہیں اس لئے ان کا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس اللہ رب العزت کا علم کامل و صحیح ہے۔ اس لئے اسکے اندازہ میں کسی قسم کی غلطی کا امکان نہیں ہے۔

اس نے اس کائنات کو پیدا فرمایا اور کائنات کی تمام حقیقتوں کی خلقت سے پہلے اندازہ اور علم تھا کہ بعد میں پیدا ہونے والی یہ تمام حقیقتیں کس نہج پر کام کریں گی۔ کتنا عرصہ کام کریں گی۔ اور ان کے کئے ہوئے کاموں میں سے کتنے کام قابلِ ستائش ہوں گے اور کتنے کام لائق مذمت۔

اسی لئے فرمایا:

"انا کل شیء خلقناہ بقدر۔" (القمر: ۲۷: ۴۹)

"ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے (تقدیر یعنی علم سابق) کے مطابق پیدا کیا ہے"۔

"قد جعل اللہ لکل شیء قدراً (الطلاق: ۲۸: ۳) "اللہ رب العزت نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرر کیا ہے"۔

علم الٰہی میں افعال و اعمال اختیاریہ کے متعلق یہ بات طے شدہ ہے کہ فلاں فلاں شخص اپنے ارادہ و اختیار سے فلاں فلاں عمل فلاں فلاں وقت میں کرے گا لہذا یہ ضروری ہو گا کہ وہ شخص اپنے ارادہ و اختیار ہی سے وہ عمل انجام دے ورنہ ایک چیز کا علم الٰہی کے خلاف واقع ہونا لازم آئے گا جو محال ہے۔

اللہ رب العزت کا علم قدیمی و ازلی ہے وہ ازل سے پوری کائنات کے متعلق جانتا ہے۔ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ ابھی وقوع پذیر ہونے پر نہیں جان رہا بلکہ کائنات کے بننے سے قبل اس کے علم میں ہے۔

اگر ابھی کے علم الٰہی کا ایمان رکھا جائے تو اللہ رب العزت کی ذات بھی ایک وقت کے لئے بے اختیار ماننا پڑے گی جو عقیدہ و ایمان کے خلاف ہے۔

پس جو ہر فعل کو قدیم سے جانتا ہے اسی طرح بندے کے اعمال و افعال کو جانتا ہے اور اس سے بندہ ہرگز ہرگز مجبور دکھائی نہیں دیتا۔ علم ازلی قدیم عامل کے ارادہ و اختیار کی نفی ہرگز نہیں کرتا۔

(مثال)

اس حقیقت کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں :

ریل گاڑی کی آمد و رفت حتی الامکان طے شدہ ٹائم ٹیبل کے موافق و مطابق ہوتی ہے۔ کیا اس ٹائم ٹیبل کو ریل کے چلنے اور اس کی حرکت میں ذرہ برابر دخل ہے؟ ظاہر ہے کچھ بھی دخل نہیں۔ سمجھنے کے لئے علم الٰہی کو ٹائم ٹیبل سمجھیں فرق صرف یہ ہے ٹائم ٹیبل بنانے والوں کا علم چونکہ محیط و کامل نہیں وہ لوگ محض اپنے قواعد و اصول کی بناء پر طے کر لیتے ہیں کہ فلاں اسٹیشن پر گاڑی فلاں وقت پہنچے گی۔ ان کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ کسی دن درمیان میں لائن ٹوٹ جائے گی یا انجن خراب ہو جائے گا اس لئے گاڑی لیٹ ہو جائے گی۔

اس قسم کی جزئیات و عوارضات کا علم ان کو محیط نہیں ہوتا اس وجہ سے ٹائم ٹیبل کے شیڈول میں تبدیلی و تغیر کا آنا ناگزیر ہے لیکن علم الٰہی تمام جزئیات و عوارضات و موانعات پر ہو بہو بجمیع تفصیلہا محیط ہے ۔ لہذا ذرہ برابر بھی تغیر و تبدل ممکن نہیں ۔

انجن کی حرکت اور بھاپ کے فعل میں اس ٹائم ٹیبل کو کوئی دخل عمل نہیں ۔ انجن بھاپ کی طاقت اور اپنی حرکت سے ڈرائیور کے ارادہ و اختیار کے موافق و مطابق چلتا ہے ۔ ٹائم ٹیبل کا اس حرکت کرنے میں کوئی دخل نہیں ۔

پس اس طرح علم الٰہی قدیم عامل کی قدرت و اختیار کو سلب نہیں کرتا ۔ بلکہ علم تو معلوم کے تابع ہوتا ہے ۔ کیونکہ علم تو معلوم کے صحیح انکشاف و اظہار کا نام ہے ۔ معلوم کے واقع ہونے میں کوئی دخل نہیں ۔

عام طور پر لوگوں کو یہ شبہ لاحق ہوتا رہتا ہے کہ جب سب کچھ اللہ رب العزت نے پہلے ہی سے مقدر کر دیا ہے اور لوحِ محفوظ پر لکھ دیا ہے اور اس کا لکھا ہوا ٹل نہیں سکتا تو ہماری کوشش و سعی کا کوئی فائدہ نہ رہا ہم خواہ نیک عمل کریں یا بد ہوگا بہرحال وہی جو پہلے مقدر ہو چکا ہے ۔

اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ امر واقع یہ نہیں ہے کہ جو کچھ اللہ رب العزت نے پہلے جانا یا جو پہلے لکھ دیا وہ ہم نے کرنا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے اپنے اختیار و ارادہ سے کرنا تھا اللہ رب العزت کو ازل میں پہلے سے اس کا علم تھا کیونکہ ہمیشہ علم ، معلوم اور واقع کے مطابق ہوتا ہے ۔ معلوم اور واقع علم کے مطابق ہوتا ہے ۔ جیسے ایک انجینئر کہتا ہے کہ یہ ڈیم سو سال تک کارآمد رہے گا اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ چونکہ انجینئر نے سو سال کی پیش گوئی کر دی ہے اس لئے اب خواہی نخواہی اس ڈیم کو سو سال تک کام کرنا پڑے گا ۔ بلکہ امر واقع یہ ہے کہ اس ڈیم کے میٹریل اس کی ساخت اور طاقت و قوت کے اعتبار سے انجینئر نے پہلے سے یہ جان لیا تھا کہ یہ ڈیم کب تک کارآمد رہ سکتا ہے ۔ پس اسی طرح بلا

تشبیہ و تمثیل اللہ رب العزت نے انسان کی عقل و ذہن کی کارکردگی، اس کے ذہنی رجحان اور نیکی یا بدی کے بارے میں اس کے اختیار و ارادہ کو پہلے سے جان لیا یہی اس کا علم ازلی ہے۔ اسی کو تقدیر کہتے ہیں اور یہی مکتوب لوحِ محفوظ ہے۔ قرآن مجید نے فرمایا۔

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ۔ (القمر: ۵۲:۱۷)

"ہر وہ کام جو انسان کرتے ہیں وہ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے"۔ یعنی ہم اپنے اختیار و ارادے سے جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ رب العزت کو پہلے سے معلوم تھا اور اس نے اس کو لکھا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ علام الغیوب ہے۔ یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ جو کچھ اس کو معلوم تھا اور اس نے لکھا ہوا تھا وہ ہم نے کرنا ہے کیونکہ علم معلوم اور واقع کے مطابق ہوتا ہے معلوم اور واقع علم کے مطابق نہیں ہوتا۔

مسئلہ تقدیر تاریخی تناظر میں

تاریخ میں مسئلہ تقدیر پر بہت اختلافات رونما ہوتے رہے جن میں تین فرقوں کے بارے میں عرض کرنا ضروری ہے تاکہ ہم اپنی اصلاح کر سکیں معتزلہ میں دو فرقے گردانے جاتے ہیں۔

۱۔ معتزلہ مقدمین۔

۲۔ معتزلہ متاخرین۔

معتزلہ مقدمین اور مسئلہ تقدیر

معتزلہ مقدمین علم الٰہی قدیم محیط کی نفی کرتے ہیں۔ ان کا یہ اشکال صحیح مسلم کی کتاب الایمان میں وارد شدہ روایت سے ہوا ہے۔

ان لا قدر وان الامر انف۔

"یعنی تقدیر کوئی چیز نہیں اور بندہ جو کچھ کام کرتا ہے اللہ رب العزت کو پہلے سے ان افعال و اعمال کا کوئی علم نہ تھا"۔

معاذ اللہ کچھ نہ جانتا تھا کہ بندے جا کر کیا کام کریں گے۔ بلکہ اعمال و افعال کے صادر ہو چکنے کے بعد اللہ رب العزت کو علم ہوتا ہے جیسے بندوں کو ہوتا ہے۔ یہ اشکال و شبہ تمام احادیث کے مابین مطابقت نہ کر سکنے کی بناء پر ہوا ہے۔

اگر تمام احادیث جو تقدیر کے متعلق ہیں ان کو پڑھ لیا جائے تو اشکال کا خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مندرجہ بالا عقیدہ رکھنے سے اللہ رب العزت کی طرف جہل کی نسبت آتی ہے جو سخت ترین گستاخی ہے۔ یہ عقیدہ جہل مقدمین معتزلہ کا تھا۔

متاخرین معتزلہ اور مسئلہ تقدیر

متاخرین علم الٰہی قدیم محیط مانتے ہیں کہ اللہ رب العزت کا علم ازلی قدیم ہے۔ وہ اعمال و افعال کے صادر ہونے سے پہلے جانتا ہے۔ انسانوں کے اعمال و افعال وجود میں آنے سے پہلے اللہ رب العزت کے علم قدیم محیط میں طے شدہ ہیں یہاں تک اہل سنت کے ساتھ متفق ہیں۔

متاخرین معتزلہ ذات باری کو جہل کے عیب سے منزہ سمجھتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ "اللہ رب العزت خالق تو ضرور ہے لیکن ان کے اعمال و افعال کا خالق نہیں ہے۔ بندے اپنے اعمال و افعال کے خود خالق ہیں۔ اللہ رب العزت کو ان کے اعمال و افعال میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ کہتے ہیں کہ بندے دونوں قسم کے کام کرتے ہیں اچھے بھی اور برے بھی۔ اگر اللہ رب العزت کو جملہ اعمال و افعال کا خالق قرار دیا جائے تو شرور و قبائح کی نسبت اس کی طرف لازم آتی ہے۔ جو محال ہے۔ مقدمین معتزلہ نے سرے سے علم الٰہی ہی کا انکار کر دیا۔

نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری

یعنی اللہ رب العزت نے ساری مخلوقات پیدا فرما دیا اور انسانوں

میں ہر قسم کے کام کرنے کی قدرت اور قوتیں بھی رکھ دیں ۔ اب چل کر انسان ان قوتوں کو کن کاموں سے استعمال کریں گے اچھے یا برے میں ۔ ان امور کا اللہ رب العزت کو علم نہ تھا ۔ لہذا متاخرین معتزلہ نے یہ سمجھا کہ علم الٰہی کا انکار کرنا تو انتہائی بدترین حماقت و جہالت ہے ۔ ہاں انسانوں کے اعمال و افعال کو انہی کی ذوات تک محدود رکھا جائے ۔ اور ان افعال کا رشتہ انتساب اللہ رب العزت سے منقطع کر لیا جائے تو پھر ان کے برے اچھے کی ذمہ داری بھی انہی پر عائد ہو گی ۔ شرور و قبائح کی نسبت اللہ رب العزت کی طرف نہ رہے گی ۔ اس لئے انہوں نے دعویٰ کر دیا کہ انسانوں کے اعمال و افعال خود بندوں کی مخلوق ہیں ۔ ان کے صدور میں اللہ رب العزت کے ارادے اور مشیت و قدرت کو کوئی عمل دخل نہیں ۔ متاخرین نے علم الٰہی قدیم محیط مان کر بندوں کو خالق افعال و اعمال مانا جو شرک کے زمرے میں آتا ہے ۔ یہ عقیدہ بھی قرآن و سنت کے خلاف ہے لہذا مقدمین و متاخرین معتزلہ دونوں توہین و شرک کے مرتکب ہوئے ۔

فرقہ جبریہ اور مسئلہ تقدیر

معتزلہ نے تو انسان کو اپنے افعال و اعمال کا خالق قرار دیا تھا ۔
جبریہ نے معتزلہ کے بالکل برعکس اپنے افعال کا خالق ہونا تو کجا بلکہ

اپنے افعال میں بالکل مجبور محض ہیں ۔ انسان کا اپنے اعمال و افعال میں اپنے ارادہ و اختیار کا کوئی عمل دخل نہیں ۔ یہ انسان کو ایسا مجبور محض مانتے تھے جیسے اینٹ ، پتھر وغیرہ ۔

فرقہ قدریہ اور مسئلہ تقدیر

یہ جبریہ کے برعکس تقدیر کا کلی طور پر انکار کرتے ہیں ۔
ان تمام فرقوں کے عقائد و نظریات پر آگے روشنی ڈالی ہے ۔ لہذا صفحہ نمبر پر ملاحظہ فرمائیں

جناب علی المرتضیٰؑ کا قول
انسان کے مجبور یا مختار ہونے پر

آپؑ سے کسی نے اس مسئلے کے بارے میں استفسار کیا تو آپؑ نے سائل سے فرمایا کہ اپنی ایک ٹانگ اوپر اٹھاؤ اس نے اٹھائی پھر فرمایا کہ اب دوسری ٹانگ بھی اٹھاؤ۔ اس نے عرض کیا یہ تو ناممکن ہے تو آپؑ نے اس مثال کے ذریعہ انسان کے مجبور یا مختار ہونے کی حقیقت کو بیان فرما دیا فرمایا "پہلی حد انسان کے اختیار کی تھی" اور دوسری حد اس کی مجبوری کی ہے

بین القدر و الجبر کا حقیقی مفہوم

اب ان مراحل کا ذکر کرتے ہیں کہ جن مراحل سے گزر کر کوئی عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے، ان مراحل کو سمجھنے کے بعد بین القدر والجبر کا حقیقی مفہوم واضح ہو جائے گا کیونکہ کسی عمل کا انجام پر پہنچنا ان مراحل سے گزر کر ہی ہوتا ہے بعض کو ان مراحل کا شعور و ادراک ہوتا ہے اور بعض کو بے علمی کی وجہ سے نہیں لہذا ہم بالترتیب ان مراحل کا ذکر کرتے ہیں

۱۔ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی خواہش کی کشمکش کا مرحلہ

سب سے پہلے انسان کے دل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ بیک وقت دونوں احساس اس کے دامنگیر ہوتے ہیں کہ یہ کام کرے یا نہ کرے۔ یہاں پر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ یہ احساس صرف شعوری اور اختیاری اعمال و افعال سے متعلق ہوتا ہے۔ اضطراری اعمال کا ان مراحل سے کوئی تعلق و واسطہ نہیں ہوتا۔

اختیاری اور اضطرای فعل میں فرق

اختیاری اور غیر اختیاری فعل میں فرق سمجھنے کے لئے مثال پر غور کریں مثلاً۔ کوئی شخص آپ کی آنکھوں میں سوئی چبھونا چاہے تو سوئی کے سامنے آتے ہی پلکیں غیر اختیاری طور پر بند ہو جائیں گی۔ اور ایسا فعل قابل مواخذہ و گرفت بھی نہیں۔ اور اگر یہی پلکیں بدنیتی سے کسی فعل ناحق کے لئے حرکت کریں تو یہ اختیاری اور ارادی فعل کہلائے گا۔ اور اس ارادی فعل پر مواخذاہ و گرفت ہوگی۔ حرکت ایک ہے مگر ارادے اور نیت نے اسے کچھ سے کچھ بنادیا ہے۔ بہرحال سب سے پہلے ذہن میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ کہ یہ مال چوری کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ یہ سب سے ابتدائی مرحلہ ہوتا ہے اور اسے کشمکش کا مرحلہ کہتے ہیں

غور و خوض کا مرحلہ۔

کشمکش کے بعد اس کام کے غور کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے ذہن کرنے کے فوائد اور نہ کرنے کے نقصانات دونوں کا جائزہ لیتا ہے۔ یعنی دونوں طرف کے ممکنہ نتائج کیا ہیں۔ ذہن میں خدائی حکم بھی آتا ہے۔ کہ کرنے پر کیا اجر و ثواب اور نہ کرنے پر کیا عذاب و عتاب ہوگا؟

یہ طرح فعل کا ذہنی وجود کشمکش کے ابتدائی مرحلہ سے گزر کر غور وخوض کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ کشمکش اور غور و خوض کے دونوں مرحلوں پر انسانی ذہن کسی قسم کی مجبوری اور پابندی کا شکار نہیں ہوتا۔ یہ دونوں عمل کشمکش اور غور وخوض ذہن اور شعور کی سطح پر آزادانہ طریقے سے واقع ہوتے ہیں۔

انتخاب نیت کا مرحلہ

یہ مرحلہ ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے یہاں پر انسان دو راستوں میں ایک کا انتخاب کرتا ہے ۔ پوری سوچ بچار کے بعد اسے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے : کہ وہ اچھائی کا مرتکب ہو یا برائی کا ۔ صحیح راستے پر گامزن ہو یا غلط راستے پر حکم الہی کی پیروی کرے یا نفس کی اسی ذہنی فیصلے کو انتخاب نیت کہتے ہیں آپ ٹھنڈے دل سے سوچ کر بتائیں ۔ کیا ان تینوں مرحلوں میں کسی اعلی قوت نے انسان کو مجبور کیا اسے اختیار کرنے یا نہ کرنے پر کوئی خارجی دباؤ پڑتا ہے ۔ ہرگز نہیں یہ تو خالصتاً ذہنی و قلبی فیصلہ ہوتا ہے ان تینوں مراحل میں اعمال وافعال مکمل طور پر آزادانہ طور پر کیے جاتے ہیں ۔

ارادے کا مرحلہ

ان تینوں مرحلوں کے بعد انسان اسے واقعہ بنانے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے ذہنی طور پر کمر بستہ ہو جاتا ہے ۔

نیت اور ارادے میں فرق

یہاں پر نیت اور ارادے کا فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ نیت ذہنی سطح پر کسی چیز کو منتخب کرنے کا نام ہے اور عزم و ارادہ اس نیت کی تکمیل پر ذہن کے کمر بستہ ہوجانے کا نام ہے ۔ ہاں عزم و ارادہ نیت کے انتخاب سے جنم لیتا ہے نیت مقدم اور ارادہ موخر لہذا ہمیشہ عزم و ارادہ نیت کے تابع ہوتا ہے ۔

تعمیل کا مرحلہ

پانچواں مرحلہ ارادے کی تعمیل کا کہلاتا ہے جہاں پہنچ کر انسان عملی تدبیر کے لیے سر گرم ہوجاتا ہے ۔ مثلاً اگر آپ نے کسی دشمن کے مارنے کا ارادہ کرلیا ہے تو آپ کے عمل کا پانچواں مرحلہ کسی ہتھیار کے ساتھ اس پر حملہ کرنا ہوگا ۔

تعمیل ارادے کے تابع ہوتی ہے

نتیجے کا مرحلہ:

جب ارادے کی تعمیل ہو چکی تو چھٹا مرحلہ نتیجے کے برآمد ہونے کا آتا ہے۔ مثلاً ہتھیار استعمال کرنے سے وہ شخص مرجائے یا زخمی ہو جائے گا۔ یہ نتیجہ آپ کے مرحلہ تعمیل کے تابع ہے، مرحلہ تعمیل عزم و ارادے کے تابع ہے اور مرحلہ نیت کسی کے تابع نہیں ہے۔ کیونکہ مرحلہ نیت غور و خوض کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے ان چھ مراحل سے گزر کر عمل اپنے منطقی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ ان مراحل میں سے کوئی بھی ایسا مرحلہ نہیں ہے جہاں پر کوئی خارجی دباؤ ہو۔ ذہنی کشمکش سے لیکر نتیجے تک انسان خود بخود عمل کرتا ہے اور یہ اقدام کسب عمل ہے۔

انتخاب نیت کی اہمیت

ان چھ مراحل میں انتخاب نیت کو قرآن و حدیث کی نظر میں بنیادی حیثیت حاصل ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

انما الاعمال بالنیات (رواہ البخاری)

"اعمال کا دارومدار نیت پر ہے" دوسرے مقام پر فرمایا:

ان اللہ لا ینظر الی صورکم و اموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم و اعمالکم

(رواہ مسلم)

"بے شک اللہ رب العزت تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتے بلکہ تمہارے اعمال اور دلوں کو دیکھتے ہیں۔"

اللہ رب العزت کے نزدیک عمل کی ذمہ داری کا فیصلہ انسان کی نیت، اور اس کے نیت و ارادے کے مطابق ہوتا ہے

جیسی نیت ویسی مراد

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ [1]

(النساء)

"اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی رضا کی نیت سے اپنے گھر سے ہجرت کے لیے نکلے پھر راستے میں اسے موت آجائے تو اللہ رب العزت پر اس کا اجر ثابت ہو گیا یعنی اسے پورے عمل کی جزا عطا کی جائے گی۔

اللہ رب العزت کی ذات یہ نہیں دیکھتی کہ اس کا عمل اپنے انجام تک پہنچایا نہیں بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ اکتساب عمل میں اس کی نیت کیا تھی قرآن و حدیث میں نیت کے اخلاص پر زور دیا گیا ہے۔ کیونکہ اسی پر ایک شخص مسلمان اور نیت سے ہی ایک شخص منافق سمجھا جاتا ہے حالانکہ زبان اور ظاہر کی حد تک دونوں کا قول ایک ہی ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام نیت

انسان اچھائی یا برائی کے ارتکاب کے لیے جب اپنی نیت کا انتخاب کرتا ہے اس وقت وہ مکمل طور پر باشعور و بااختیار ہوتا ہے اسے دونوں راستوں سے کسی بھی راہ کو اپنانے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ مرحلہ خالصتاً اس کے اپنے ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے اسی آزادی کی بناء پر وہ شخص بااختیار تصور کیا جاتا ہے۔ بقیہ تمام مراحل عمل اس کی آزادانہ منتخب نیت کے تابع ہوتے ہیں۔

خارجی مجبوریوں اور معاملات کی پریشانیوں کا دباؤ کا اثر نیت کے مرحلے پر نہیں بلکہ چوتھے مرحلے عزم و ارادہ پر ہوتا ہے۔۔ شاذ و نادر عمل نیت کے خلاف بھی ہو سکتا ہے ایسی صورت حال کو جبر و اکراہ کہیں گے۔ اصول و کلیہ ہر شخص اپنے آزاد انتخاب نیت کے باعث پابند جزاء و سزا ہے۔

علامہ تفتازانی کے نزدیک مسئلہ جبر و قدر

وللعباد و افعال اختيارية يثابون بها ان كانت طاعة ويعاقبون عليها ان كانت معصية لا كما زعمت الجبرية انه لا فعل للعبد اصلاً و ان حركاته بمنزلة حركات الجمادات لا قدرة عليها ولا قصد ولا اختيار وهذا باطل لانا نفرق بالضرورة بين حركة البطش وحركة الارتعاش نعلم ان الاول باختياره دون الثاني ولانه لولم يكن للعبد فعل اصلاً لما صح تكليفه، ولا يترتب استحقاق الثواب والعقاب على افعاله ولا اسند الافعال التي تقتضي سابقية القصد والاختيار اليه على سبيل الحقيقة مثل صلي وكتب وصام بخلاف مثل طال الغلام واسود لونه۔

ان الله خالق والعبد كاسب وتحقيقه ان صرف العبد قدرته وارادته الي الفعل كسب و ايجاد الله تعالي الفعل عقيب ذالك خلق والمقدور الواحد داخل تحت قدرتين لكن بجهتين مختلفتين فالفعل مقدور الله تعالي بجهة الايجاد و مقدور العبد بجهة الكسب كالارض تكون ملكا الله تعالي بجهة التخليق وللعباد بجهة ثبوت التصرف۔ (شرح عقائد نسفي ۶۴)

علامہ سعد الدین تفتازانی شرح عقائد نسفی میں فرماتے ہیں:

"اور بندوں کو اپنے افعال کا اختیار حاصل ہوتا ہے اس بناء پر اگر یہ افعال طاعت پر مبنی ہوں تو ان کا ثواب ملتا ہے اور اگر معصیت پر ہوں تو ان پر عذاب دیا جاتا ہے۔ فرقہ جبریہ کا یہ کہنا غلط ہے کہ بندے کو اپنے افعال کا کچھ اختیار ہی نہیں۔ اس کی حرکات و سکنات تو محض جمادات کی حرکات کے مشابہ ہیں۔ جنہیں اپنے افعال پر نہ قدرت حاصل ہوتی ہے اور نہ قصد و اختیار۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بندے کو اپنے افعال کا اختیار ہی نہیں تو اس کا احکام الٰہی کا مکلف ٹھہرایا جانا اور اس کا عذاب و ثواب کا مستحق ہونا نیز افعال کا اس کی طرف منسوب ہونا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ یہ مسلم

افعال میں حرکت سے پہلے قصد اور اختیار ہوتا ہے ۔ اس ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے نماز پڑھی ۔ اس نے لکھا جو اشیاء اس کی قدرت سے باہر ہیں کے متعلق انداز مختلف ہوتا ہے ۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ اس نے روزہ رکھا جبکہ لڑکا بڑا ہو گیا ۔ اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا ۔ افعال کی نسبت بندے کی طرف نہیں کی جاتی بے شک اللہ رب العزت خالق ہیں اور بندہ اعمال کا کاسب ہے ۔

تحقیق اس کی اس طرح ہے کہ بندہ اس کام میں اپنی قدرت اور صلاحیت صرف کرتا ہے لہذا یہ کسب ہے ۔ اور اللہ رب العزت اس کی کوشش کے بعد اس فعل کو موجود کر دیتا ہے ۔ یہ خلق ہے ۔ ایک ہی فعل دو قدرتوں سے وجود میں آتا ہے ۔ لیکن دو مختلف جہتوں سے فعل اپنے وجود کے اعتبار سے خدا کا فعل ہے ۔ مگر اپنے کسب کے اعتبار سے بندے کا جس طرح زمین تخلیق کے اعتبار سے اللہ رب العزت کی ملکیت ہے اور ثبوت تصرف کے اعتبار سے بندے اس کے مالک ہیں ۔

علامہ تفتازانیؒ کی مندرجہ بالا بحث سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اگرچہ ہر چیز اللہ رب العزت کے فعل خلق کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتی ہے لیکن عملی طور پر بندہ اپنے افعال میں کسب کا اختیار رکھتا ہے ۔ اور اسی اختیار کی بنیاد پر اپنے ہر عمل کا ذمہ دار اور اس پر جزا و سزا کا مستحق قرار دیا گیا ہے ۔

تاجدار کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تقدیر کے بارے میں کرید کرید کر گفتگو کرنے سے منع فرمایا ہے ۔ ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"شیطان تمہارے پاس آتا ہے اور تم سے سوال کرتا ہے کہ تمہیں کس نے پیدا کیا فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا یہاں تک وہ آپ سے سوال کرتا ہے اللہ رب العزت کو کس نے پیدا کیا" ۔ تو یہاں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "یہاں رک جاؤ اور شیطان کے شر سے پناہ مانگو اس سے آگے نہ بڑھو کیونکہ ان وسوسوں سے انسان گمراہ ہو جاتا ہے ۔

تقدیر کے مسئلے میں قرآن مجید جس کلیے پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے اس کا ماحصل یہ ہے "انسان نہ کلیتاً مختار نہ تنہا مجبور ہے" یہی اہلسنت کا عقیدہ ہے۔

۱۔ اگر انسان کو کلیتاً مجبور محض سمجھ لیا جائے تو پھر وہ ہر ذمہ داری سے بری الذمہ قرار دیا جائے گا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

۲۔ اگر انسان کو کلیتاً مختار مان لیا جائے تو پھر اس پر کوئی قدغن عائد نہ ہوگی جو قدرت الٰہی کے خلاف ہے۔ بس اس کی حیثیت بین القدور والجبر ہے۔

خلقِ عمل اور کسب عمل میں فرق

انسان اور اس کے جملہ اعمال و افعال کو اللہ رب العزت نے تخلیق کیا ہے۔

واللہ خلقکم وما تعملون (الصٰفٰت ۳۷: ۹۶)

"تم کو اور تمہارے اعمال کو خدا نے ہی پیدا کیا"۔

اس آیت میں انسان اور اس کے اعمال دونوں کی تخلیق کو اللہ رب العزت کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

تخلیق اور کسب دو مختلف المعانی اور مختلف المقاصد الفاظ ہیں کسب اسی سے اکتساب بروزن افتعال ہے۔ جس کے معنی کرنے یا کمانے کے ہیں جبکہ خلق اور تخلیق کے معنی کوئی چیز پیدا کرنے اور عدم سے وجود میں لانے کے ہیں۔ انسان اپنے اعمال و افعال کا کرنے والا ہے۔ اور ان کا خالق اللہ رب العزت کی ذات ہے۔ انسان اور اس کی تمام تر اشیاء و اعمال مخلوق محض ہیں۔ اس طرح کائنات میں صرف دو تصور رہ جاتے ہیں:

۱۔ اللہ رب العزت کا خالق ہونا۔

۲۔ انسان و جملہ اشیاء کا مخلوق ہونا۔

خالق ہر فعل میں خالق ہے اور مخلوق اپنی ہر صفت میں مخلوق ہے۔ جملہ اعمال و افعال کو اللہ رب العزت نے پیدا کیا ہے۔ ہم صرف ان کے مرتکب

انسان اپنی رضا و رغبت سے کرتا ہے ۔ فعل کے انجام دینے کی ذمہ داری انسان پر عائد کی گئی ہے گویا عمل ایک ہے مگر اس کے پہلو دو ہیں ۔ ایک پہلو کے اعتبار سے وہ خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے اور دوسرے پہلو کے اعتبار سے وہ فعل انسان کا مکسوب ہے ۔

اس تصور کو سمجھنے کے لئے بچے کی تخلیق کے عمل پر غور کریں یہ حقیقت خود بخود واضح ہوتی جائے گی ۔

ہر شخص جانتا ہے کہ بچہ محض مرد و عورت کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جانے ہی سے پیدا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی پیدائش کے لئے امرِ ایزدی کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے ۔ کتنے ایسے جوڑے ہیں جن کے دامن برسہا برس گزر جانے کے باوجود بچوں کی نعمت سے محروم ہیں ۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچے کی تخلیق میں بنیادی عمل دخل رشتہ ازدواج کا ہی ہوتا ہے ۔ ۔

گویا بچے کا وجود والدین کے دم قدم سے ملا اور خالقِ اللہ رب العزت کی عطا کا مرہونِ منت ہے ۔

ہر انسانی عمل اپنے کسب میں انسانی ہاتھوں کا محتاج ہے مگر اپنے وجود اور اپنی ہستی میں اللہ رب العزت کے حکم کن کا دست نگر ہے ۔

اعتراض : انسانی عمل دیکھنے میں تو انسان ہی کی تخلیق محسوس ہوتا ہے اسے انسانی کسب سے الگ مخلوق ماننا ذہن قبول نہیں کرتا ۔

جواب : ہر مخلوق چیز کا دکھائی دینا ضروری نہیں ہے یہ بات درست نہیں ہے کہ جو چیز دکھائی دے وہ مخلوق ہے اور جو دکھائی نہ دے وہ مخلوق نہیں ہے اللہ رب العزت نے قسم کھا کر فرمایا :

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ـ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ـ الحاقۃ ۲۹ : ۳۹

"قسم ہے ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو اور جن کو تم نہیں دیکھ سکتے " ۔

سائنس بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ دنیائے کائنات میں بہت سی اشیاء موجود ہونے کے باوجود دکھائی نہیں دیتیں ۔ کمرے میں ہواؤں کے جراثیم موجود ہونے کے باوجود دکھائی نہیں دیتی ۔ انسانی آواز

موجود ہونے کے باوجود دکھائی نہیں دیتی۔

کسی چیز کا دکھائی دینا اس وقت ضروری ہوتا ہے جس کا صبعی وجود کثیف ہو اور اس کو محسوس اور معلوم کرنے کی حس بھی صحیح حالت میں ہو جو اشیاء غیر حسی ہوں وہ پائے جانے کے باوجود دیکھی نہیں جا سکتیں انسان خود حسی اور کثیف وجود رکھتا ہے اس لئے اس کا وجود آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر انسانی عمل بذات خود ایک لطیف وجود ہے۔ اس کے نتائج و ثمرات کو دیکھا جاتا ہے۔ اس کے ارتکاب میں استعمال ہونے والے اعضاء کو بھی دیکھا جاتا ہے لیکن فی نفسہ عمل کے وجود کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔

مثلاً شفقت و محبت حقیقت میں اپنا وجود تو رکھتے ہیں لیکن جب تک ماں کی ممتا، باپ کی شفقت کے روپ میں نہ دیکھیں ان کا وجود از خود دکھائی نہیں دے سکتا۔ تکبر، غرور، حسد، کینہ، عداوت کا خارج میں الگ وجود دکھائی نہیں دے سکتا۔ ان کے ظہور کے لئے کسی مظہر کا ہونا ضروری ہے ان کے پائے جانے کا انکار بھی ممکن نہیں ہے ان کے سمجھنے کے لئے ذریعہ درکار ہے۔

عمل بھی بغیر انسان کے دکھائی نہیں دے سکتا عمل خارج میں موجود ہے لیکن بغیر انسان کے دکھائی نہیں دے سکتا۔ عمل انسان کی تخلیق نہیں ہے بلکہ اسے کر کے دکھایا ہے۔

جزاء و سزا کی حقیقت

عمل تخلیق کے اعتبار سے تو مخلوق خدا ہے لیکن صدور و ظہور کے اعتبار سے انسان کا کسب ہے۔ کسب و ارتکاب آزادانہ ہے اور جزا و سزا کا تعلق کسبِ اعمال و افعال سے ہے۔

اللہ رب العزت نے انسانی تخلیق کا مقصد و مدعا بیان فرما دیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (الذٰریٰت: ۲۷: ۵۶)

"جن و انس کو عبادت کے لئے پیدا کیا"۔

خیر و شر کو اللہ رب العزت نے پیدا فرمایا اور ان میں تمیز کرنے والی عقل جیسی نعمت عطا فرمائی۔ اگر خیر و شر کا بیک وقت وجود نہ ہوتا تو پھر انسانی زندگی نہ ہونے کے مترادف ہوتی۔ کیونکہ ہر چیز اپنے متضاد سے پہچانی جاتی ہے خیر و شر کی تخلیق ہی جنت و دوزخ کے وجود کا سبب ہے۔ انسانی شعور و ارادہ خیر و شر میں ترجیح دینے میں مختار ہے مجبور نہیں ہے۔

انسانی زندگی ایک آزمائش و امتحان ہے یعنی زندگی حق و باطل خیر و شر کی کشمکش کا نام ہے۔ اور اسی کشمکش میں پاس و فیل ہونا جنت و دوزخ کے وجود کی دلیل بنتا ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک: ۲۹: ۱)

"اللہ رب العزت نے موت اور زندگی کو پیدا فرمایا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے"۔

موت و حیات کی تخلیق کی غرض و غایت اچھے اور برے میں امتیاز کرنا ہے۔ یہاں پر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اچھائی اللہ رب العزت کی طرف سے ہے اور برائی اپنی طرف سے ہے۔

وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ۔ (الشوری: ۲۵: ۳۱)

"اور جو مصیبت تم پر نازل ہوتی ہے سو وہ تمہارے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے"۔

نقصانات، مشکلات اور آزمائشوں سے دوچار ہونا وہ سب اپنے اعمال و افعال کے نتائج و ثمرات ہوتے ہیں۔ انفرادی زندگی کی مشکلات اور مصائب و آلام اور آزمائش تو اپنے اعمال و افعال سے ہی ہوتی ہیں لیکن قرآن مجید میں اجتماعی زندگی کی مشکلات کو بھی لوگوں کے اپنے اعمال و افعال کے نتائج و ثمرات قرار دیا گیا ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا۔ (الروم: ۲۱: ۴۱)

"خشکی اور تری میں لوگوں کے اپنے اعمال کے سبب سے فساد پھیل گیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو ان کے بعض اعمال کا بدلہ چکھائے"۔

نعمت کے حصول میں اللہ رب العزت کا لطف و کرم شامل ہوتا ہے

لیکن معصیت کے وقوع میں خاصتاً انسان کی اپنی غلطیوں کا عمل دخل ہوتا ہے اگرچہ ہر اچھائی اور برائی کی خلقت ہوتی من جانب اللہ ہے۔ ادب بندگی یہی ہے کہ اچھائی اللہ رب العزت کی طرف منسوب کی جائے اور برائی اپنے اعمال کی طرف۔

قرآن مجید میں واضح ارشاد ہے:

ما اصابک من حسنة فمن اللہ وما اصابک من سیئة فمن نفسک (النساء: ۵:۷۹)

"تمہیں جو اچھائی پہنچتی ہے وہ اللہ رب العزت کی طرف سے پہنچتی ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہاری اپنی طرف سے ہے"

اللہ رب العزت کا فعل مطلقاً خلق ہے کسب و ارتکاب نہیں۔

خلق کا مقصد انسان سے اچھائی اور برائی میں عقل و شعور کے ذریعے فرق کرانا ہے۔ دیکھنا ہے کہ کون ہے جو عقل و شعور کے ذریعے اچھائی انتخاب کرتا ہے اور کون ہے جو عقل و شعور کے باوجود برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔

اللہ رب العزت نے ہر عمل کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ہدایت قرآن کے ذریعے اس عمل کے نتائج و عواقب سے بھی انسان کو باخبر کر دیا ہے۔ ہدایت الٰہی کے باوجود جو شخص پھر بھی اپنی مرضی سے فتنہ و شر اور بدی کا ارتکاب کرے وہ اپنے اعمال کی سزا کا کیوں نہ ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔

غلط فہمی کا ازالہ

پوری بحث سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی ہے کہ انسان سے اگر مواخذہ ہوتا ہے تو اس لئے کہ وہ بقائمی ہوش و حواس اپنی مرضی اور اپنے ارادہ و اختیار سے کسی عمل کا ارتکاب کرتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے سود و عبث ہے کہ جب ہر عمل کا خالق اللہ رب العزت ہے تو انسان کو کیوں لائق تعزیر گردانا جاتا ہے۔ انسان بلاوجہ ہرگز نہیں پکڑا جاتا اس کی گرفت اس کے کسب و اختیار کا نتیجہ ہوتی ہے۔

یہی غلط فہمی مشرکین مکہ میں بھی تھی جس کا ذکر قرآن مجید یوں کرتا ہے:

لَوْشَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ (الانعام: ۸: ۱۴۸)

"اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے اور کسی چیز کو اپنی مرضی سے حرام نہ ٹھہرا سکتے"۔

مگر اس کے جواب میں مشرکینِ مکہ کو کہا گیا کہ محض برائی کا وجود اس کے جائز ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا برائی اور اچھائی تو ازل سے موجود ہے ۔ اسی مقصد کے لئے ہے کہ اکتساب سے لوگوں میں اچھے اور برے کا امتیاز پیدا ہو سکے ۔

خدائی فعل خلق کی حقیقت

خلق کی حقیقت تو فقط اتنی ہے کہ اس نے اپنی دوسری بہت سی مخلوقات کی طرح انسانی اعمال کو بھی تخلیق فرمایا اور انسان کو بھی پیدا فرما کر اسے اختیار دے دیا کہ وہ جس قسم کے اعمال و افعال چاہے اپنے لئے منتخب کرے کیونکہ منتخب کرنے کی قوت عقل عطا فرمائی ہے جیسا عمل کرے گا ویسا اجر پائے گا۔

پوری کائنات کا نظام کسب پر چل رہا ہے خلق پر نہیں ۔ اللہ رب العزت نے ہر چیز کی ضد پیدا کی ہے تاکہ دونوں میں پہچان آسانی سے ہو سکے :

دن کے ساتھ	رات
آرام کے ساتھ	تکلیف
راحت کے ساتھ	بے سکونی
خیر کے ساتھ	شر
حق کے ساتھ	باطل
سچائی کے ساتھ	جھوٹ
رحم کے ساتھ	ظلم
نیکی کے ساتھ	بدی
جنت کے ساتھ	جہنم

اب محض ایک چیز کا موجود ہونا اس کے اپنانے کی ذمہ داری سے براءت کی دلیل نہیں ہو سکتا ۔ ایک مثال کے ذریعے آپ سمجھنے کی کوشش کریں ۔

اللہ رب العزت نے سائے کے ساتھ دھوپ کو پیدا کیا دھوپ کو اس لئے تو پیدا نہیں کیا کہ کوئی سخت گرمی میں دھوپ میں جا بیٹھے اور کسی تکلیف کے واقع ہو جانے کے بعد وہ یہ کہے کہ میری تکلیف کا سبب اللہ رب العزت کو دھوپ کو پیدا کرنا ہے ۔ اس صورت میں کون شخص اس کے قول پر یقین کرے گا ۔ الٹا ہر کوئی اسی کو کہے گا کہ اللہ رب العزت نے دھوپ اور سائے کی تخلیق تو اس لئے فرمائی تھی کہ انسان کو گرمیوں میں سائے اور سردی میں دھوپ کی راحت میسر آ سکے ۔ دھوپ کی تخلیق کا یہ مقصد نہیں کہ کوئی شخص بلا مقصد برہنہ سر یا برہنہ پا چلچلاتی دھوپ میں چلے پھرے اگر خوامخواہ کسی تکلیف سے دوچار ہو جائے تو اس غلط استعمال پر تخلیق کا کیا قصور ثابت ہو گا ۔

امرِ الٰہی کے بغیر مخلوق سے کچھ نہ ہونے کی حقیقت

بعض لوگ سب کچھ کرنے کے بعد کہہ دیتے ہیں کہ بھائی یہ سب کچھ اللہ رب العزت کے امر سے ہوا ہے ۔ کیونکہ ایک درخت کا پتہ بھی بغیر امر الٰہی کے حرکت نہیں کر سکتا چہ جائیکہ انسان امرِ الٰہی کے بغیر عمل کرے ۔ آیئے اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد اپنے کردار کو بدلنے کی کوشش کریں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیئے کون سا عمل امرِ الٰہی سے ہوا ہے اور کونسا عمل مشیتِ الٰہی کے ماتحت ہوتا ہے ۔۔

یہ درست ہے کہ اللہ رب العزت تمام کائنات کا خالق و مالک ہے اور پوری کائنات اس کی قدرت و مشیت کے ماتحت ہے تو اس کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ سب کچھ اس کی قدرت کے ماتحت ہو رہا ہے ۔ یہ کہنا کہ سب کچھ اللہ رب العزت کے حکم اور امر اور رضا کے مطابق ہو رہا ہے یہ صریح نصوص کے خلاف ہے کہ خود کسی چیز کے کرنے کا حکم دے اور پھر

اس پر سزا مرتب فرمائے یہ حکمت کے خلاف ہے ۔ کیونکہ کائنات میں چوری، قتل و غارت، ڈاکہ، زنا سب کچھ ہو رہا ہے اور اس پر یہ کہہ دینا کہ سب کچھ امر الٰہی سے ہو رہا ہے تو یہ حکمت کے خلاف ہو گا کیونکہ ان کے کرنے سے منع فرمایا ہے اور منع فرمانے کے بعد ان پر اجر و ثواب ملے تو یہ حقیقت کے خلاف ہو گا ۔ لہٰذا اس بات کو سمجھنے کے لئے اختیار و اجازت کے مابین فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ اختیار و اجازت میں فرق ہے ۔ اللہ رب العزت نے انسان کو اختیار تو دیا ہے مگر وہ افعال قبیحہ جن کو اللہ رب العزت کا ناپسند فرمانا نصوص صریحہ سے ثابت ہے ۔ اللہ رب العزت کا ان افعال کے لئے حکم دینا یا اجازت دینا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ کیونکہ اجازت دینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کام کے کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اس عمل پر باز پرس نہیں ہوگی ۔ حالانکہ برائی پر عذاب و عتاب کا ہونا قرآن و حدیث سے ثابت ہے ۔ اللہ رب العزت نے کفر و شرک کی اجازت نہیں دی ۔

ایمان و کفر دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا اللہ رب العزت نے اختیار دیا ہے ۔ کفر کی اجازت نہیں دی ۔ اللہ رب العزت نے فرمایا:

قُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۔ الکہف ۱۵/۲۹

فرما دیجئے کہ حق اللہ رب العزت کی جانب سے ہے ۔ جو چاہے ایمان لائے جو چاہے کفر کرے شک ہم نے ظالموں کے لئے ایسی آگ تیار کی ہے جس کے شعلوں کی دیوار ہر طرف سے انہیں گھیر لے گی ۔ کفر کی اجازت نہیں دی اختیار دیا ہے ۔ کفر اختیار کرنے کی سزا بھی بیان فرما دی ہے ۔ انسان شرک کرنے میں مختار ضرور ہے لیکن اجازت نہیں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۔ النساء ۱۱۶/۵

"بے شک اللہ رب العزت نہیں بخشتا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے حالانکہ اس سے کم گناہ کو بخش دیتا ہے ۔ جس کے لئے چاہتا ہے"۔

افعالِ مستحسنہ حکم الٰہی سے اور افعالِ غیر مستحسنہ نہ اللہ رب العزت کے حکم سے نہ اجازت سے ۔ بالفرض مخلوق کے تمام اعمال و افعال امر و

حکم الٰہی سے ہوں تو روزِ قیامت ابوجہل عتبہ، عتیبہ، شیبہ وغیرہ سے جواب طلبی کا کیا معنی ہو گا۔ حالانکہ وہ عذاب میں مبتلا ضرور ہیں۔ لہٰذا یہاں پر کہنا ہو گا کہ افعالِ غیر مستحسنہ میں مشیت خداوندی کارفرما تو ہوتی ہے مگر امرِ ربی نہیں۔ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اللہ رب العزت کی مشیت کے ماتحت تو ضرور ہے مگر اس کی رضا و حکم کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔

مشیت اور قدرت کا معنی و مفہوم

مشیت شا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں "چاہنا" اور اس عالم میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اللہ رب العزت کی مشیت کے ماتحت ہے۔ برائی اور اچھائی سب اللہ رب العزت کی مخلوق ہیں یہ تحت المشیت تو ہیں مگر برائی سے راضی نہیں اس لئے اس کے کرنے کا حکم نہیں دیا۔ مشیت کا مفہوم یہ ہے۔

۱۔ "خیر" کے ساتھ مشیت اس طرح متعلق ہوتی ہے کہ اس میں اللہ رب العزت کی رضا اور پسند بھی شامل ہوتی ہے اس لئے وہ خیر کا ہی حکم دیتا ہے۔

۲۔ "شر" کے ساتھ مشیت اس طرح متعلق ہوتی ہے کہ وہ شر جس طرح ہو رہا ہو۔ اسے ہونے دیا جائے اور قدرت اس سے بے نیازی اختیار کرے۔ روکنے کی قدرت کے باوجود اسے نہ روکے اس میں اللہ رب العزت کی رضا اور پسند بالکل نہیں ہوتی۔ مطلقاً یہ کہنا کہ اچھائی اور برائی سب کچھ حکم الٰہی سے ہو رہا ہے باطل ہے۔ اللہ رب العزت نے فرمایا:

ان تکفروا فان اللہ غنی عنکم ولا یرضی لعبادہ الکفر وان تشکروا یرضہ لکم۔

"اگر تم کفر کرو گے بے شک اللہ رب العزت تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں سے کفر پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر بجا لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ اس وجہ سے تم پر بہت راضی ہو گا۔ اللہ تعالیٰ برائی کو ناپسند فرمانے کے باوجود لوگوں کو ان سے زبردستی نہیں روکتا اور یہ برائی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت ضرور ہوتی ہے، مگر تحت الرضا و حکم نہیں ہوتی۔

اللہ رب العزت نے فرما دیا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
جس کو خیال نہ ہو آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

انسان کے مختار ہونے کی حکمت

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّہٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْر (حٰمٓ السجدہ: ۴۰)

"تم جو چاہو کرتے رہو وہ اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔"

اس آیۃ کریمہ کے تین الفاظ پر غور کیا جائے تو مسئلہ تقدیر کے تمام ممکنہ پہلو سامنے آجاتے ہیں اور اس بارے میں پیدا ہونے والے تمام شکوک و شبہات رفع ہو جاتے ہیں۔

۱۔ اعلموا تم عمل کرو

اس میں عمل کی نسبت انسان کی طرف کی گئی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان اپنے اعمال و افعال کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اچھے یا برے عمل کرنے کی کھلی آزادی رکھتا ہے اس پر قدرت کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاتا۔

۲۔ ماشئتم جو تم چاہو

اس میں فکری، ذہنی، قلبی آزادی کا تصور دیا گیا ہے۔ انسان نہ انتخاب نیت میں پابند و مقید ہے نہ پایہ تکمیل تک پہنچانے میں لہٰذا غور و خوض سے نتیجے تک آزاد ہے۔

۴۔ انہ بما تعملون بصیر

اس میں ذات باری تعالیٰ کی طرف سے اعمال و افعال کی جزاء و سزا کا تصور دیا گیا ہے کہ "اے عمل کرنے والے میں رب العزت تیرے اعمال و افعال کو دیکھ رہا ہوں ۔ اور تو نے ان کے متعلق جوابدہ ہونا ہے"۔ اللہ رب العزت نے لوگوں کے سامنے اپنے احکام کی اطاعت و فرمانبرداری اور خلاف ورزی کے انجام و عواقب کو بیان فرما دیا ہے ۔ واضح فرما دیا ہے کہ اطاعت میں جنت اور خلاف ورزی میں دوزخ ملے گی ۔

انسان کے مجبور نہ ہونے کی وجہ

اللہ رب العزت نے انسان کو مجبور محض پیدا نہیں کیا ۔ اگر اللہ رب العزت انسان کو پیدائشی طور پر اپنی قدرت کی زنجیروں میں جکڑ دے کہ وہ اپنی مرضی سے نہ نیکی کر سکے نہ بدی تو کیا مجبوری کی صورت میں کی جانے والی نیکی اور بدی ایسی نیکی اور بدی کہلانے کی مستحق قرار پا سکتی ہے؟ کیونکہ مجبور آدمی کی نہ اپنی نیکی ہوتی ہے نہ بدی ۔

قضاء و قدر کا انسانی زندگی میں کردار

قدر کا لغوی مفہوم اندازہ کرنا، وزن کرنا، طے کرنا اور مقرر کرنا ہے ۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

بَلْ ھُوَ قُرْآنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۔ (البروج ۳۰:۲۲)
"یہ کتاب (ہزل و بطلان نہیں) بلکہ یہ عظیم الشان ہے ۔ لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے"۔

پوری کائنات بشمول بنی نوع انسان کے احوال و کوائف کا علم اللہ رب العزت کے پاس ازل سے موجود ہے ۔ جسے لوحِ محفوظ میں حفاظت سے لکھ ہوا ہے ۔ کائنات کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ ذرہ بھی اس کلیے سے ماورا نہیں ہے ۔

احادیثِ رسولؐ کی روشنی میں قضا و قدر

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ کتب اللہ المقادیر الخلائق قبل ان یخلق السموٰت والارض بخمسین الف سنۃ قال وکان عرشہ علی الماء (رواہ المسلم)

"اللہ رب العزت نے زمین و آسمان پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی تھیں جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا۔

۲۔ ان اول ماخلق اللہ القلم فقال لہ اکتب فقال ما اکتب؟ قال اکتب القدر فکتب ماکان وما ھو کائن الی الابد (رواہ الترمذی)

"سب سے پہلے اللہ رب العزت نے قلم کو تخلیق کیا اور اسے حکم دیا کہ لکھ اس نے عرض کیا کہ کیا لکھوں؟ فرمایا مخلوقات کی تقدیریں لکھو۔ چنانچہ اس نے جو چیز ہو چکی تھی اور جو چیز ہونے والی تھی سب لکھ دی۔

اس موضوع پر بے شمار احادیث اور روایات مروی ہیں۔ تمام محدثین نے ثقہ راویوں سے نقل کی ہیں۔ ان روایات کے مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ قضاء و قدر کی حقیقت نہ سمجھنے کی بناء پر عوام میں بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ عوام کا ان احادیث کے متعلق یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ انسان نوشتہ تقدیر کے سامنے مجبور محض ہے اللہ رب العزت نے تقدیر میں انسانوں کو مقید کر دیا ہے وہ اس سے سرمو انحراف نہیں کر سکتے۔

قضاء و قدر کا مفہوم نہ سمجھنے کی بناء پر یہ غلط تاثر پھیلا ہے۔ آیئے سب سے پہلے ان دو اصطلاحوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قضاء و قدر کے دو مفہوم ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ آفاقی و کائناتی

۲۔ شخصی و انفرادی

قضا و قدر کا آفاقی و کائناتی مفہوم

قضا قدر کا آفاقی و کائناتی اعتبار سے مفہوم یہ ہے کہ قضا کا مفہوم تخلیق اور قدر کا مفہوم اختیار ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰي فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (حٰم السجدہ ۱۲)

"پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس کے کام کا حکم بھیجا۔ ساتوں آسمان زمین اور کائنات کے ساتوں طبقات پیدا کرنا قضاء ہے۔ قضاء خلق کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ جبکہ قدر قدرت اور تقدیر و قدیر کے الفاظ جو قرآن مجید میں کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ ان کا مفہوم اختیار کرنا ہے۔

اس طرح قضاء و قدر کے دو لفظوں میں تخلیقِ کائنات اور اس کی بقاء و سالمیت کا راز پنہاں و پوشیدہ ہے۔

شخصی و انفرادی زندگی میں قضاء و قدر کا مفہوم

انسان کی انفرادی و شخصی سطح پر قدر کے معنی اندازہ کرنا اور قضاء کے معنی اجراء کے ہیں۔ اللہ رب العزت نے اچھائی اور برائی کو پیدا کر کے انسان کو ان کے اختیار کرنے کی قدرت عطا فرمائی ہے۔ چاہے تو وہ نیکی کرے چاہے تو وہ برائی کو اپنا وطیرہ بنا لے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (البلد)

"بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے (یہ چیزیں بھی دیں) اور اس کو (خیر و شر) کے دونوں راستے بھی دکھا دیئے۔

قضاء کا مفہوم

قضاء سے مراد وہ اصول اور قوانینِ فطرت ہیں جن کے ماتحت یہ کارخانہ قدرت اپنے اپنے وقت پر اور اپنے مخصوص خصائص و مصالح کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے اور جن کے ماتحت اس کائنات کے نظام کی بقاء کو علت

و معلول، سبب اور مسبب، عمل اور ردِ عمل کے نظام کے ماتحت منضبط کر دیا گیا ہے۔ نیکی کے ثمرات و نتائج اچھے اور برائی کا انجام برا ہو گا۔ جس مقصد کے لئے تگ و دو اور کوشش و محنت کرے گا اسکے حصول میں کامیابی و کامرانی ہو گی۔۔ اس تمام نظامِ قدرت کا نام قضائے الٰہی ہے جس کا ذکر اللہ رب العزت نے یوں بیان کیا:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (البقرہ: ۲)

"بے شک جو لوگ کافر ہیں انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو انکے لئے برابر ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔"

جو شخص ہدایت کی تمام تر جلوہ گاہوں کے باوجود کفر پر ڈٹا رہا اس کا ہدایت سے محروم رہنے کا فیصلہ قدرت کی طرف سے صادر کر دیا۔ جاتا ہے۔ ہدایت سے محروم رہنا مجبور ہونا نہیں ہوتا خود اس کے اپنے فعل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت نے ایسے لوگوں کی قلبی کیفیت کو یوں بیان فرمایا:

کَلَّا بَلْ سکۃ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (المطففین ۳۰)

"دیکھو یہ جو (اعمال بد) کرتے ہیں ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے"۔

ایسے مقامِ ضلالت کی کیفیت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں بیان فرمایا

"جب کوئی شخص نیکی کرتا ہے تو اس کے دل پر نور کا نکتہ ثبت ہو جاتا ہے اور اس طرح نیکیاں کرنے سے دل بقعہ نور بن جاتا ہے"۔

اس کے برعکس برائی کرنے سے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگا دیا جاتا ہے۔ توبہ نہ کرنے اور گناہ پہ گناہ کرنے کے باعث پورا دل سیاہ بادلوں کی مانند ظلمت کدہ بن جاتا ہے۔ پھر اس حالت میں ایسے شخص میں قبولِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ ایسا شخص مجسمہ شیطنیت اور سرچشمہ شر بن جاتا ہے۔ یہاں پر یہ خیال کرنا غلط ہے کہ دل کا تاریک ہونا اور قلوب اذہان پر مہرِ خداوندی ثبت ہو جانا کوئی ظلم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خود ان کے اعمال و افعال کے کسب کا نتیجہ و ثمرہ ہے جو عمل کیا وہی اس کا ردِ عمل ظاہر ہوا۔

قانونِ قدرت کے ماتحت نافرمان بندوں کو قبولِ حق کے اختیار کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت کی طرف سے حق کی دعوت کا سلسلہ جاری رہتا ہے

بند نہیں ہوتا توبہ واستغفار کے دروازے بند نہیں کئے جاتے یہ سب کچھ حکم قدر کے تحت ہمیشہ سے جاری رہا ہے اور رہے گا۔

کوئی شخص برائی کی زندگی از خود اختیار کرتا ہے اور پھر اس راستے پر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اب اگر مردہ دل ہو جانے کی وجہ سے اس میں قبول حق کی صلاحیت نہ رہے تو کیا اس میں کسی دوسرے کا کوئی قصور داخل ہے۔ کیا یہ کہنا درست ہو گا یا اس کے کہنے کا کوئی جواز رہے گا کہ میرا مقدر ہی خراب تھا بلکہ اسے تو چاہیئے تھا کہ وہ پہلے اپنے باطن کی اصلاح کرے جہاں سے اصل بگاڑ اور فساد شروع ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے تمام وعظ و نصیحت بے اثر ہو گئی ہے۔ لہذا باطن کی اصلاح کر کے وعظ و نصیحت کی طرف دھیان دینا چاہیے۔

قدر مقدم قضاء موخر

قضاء و قدر دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں قدر کا تعلق بندے کے اختیار اور فعل سے ہے۔ قضاء کا تعلق اللہ رب العزت کے حکم نفاذ سے ہے۔ ان کی ترتیب یہ ہے قدر مقدم اور قضاء موخر ہوتی ہے۔

اللہ رب العزت نے اپنے عالم الغیب والشھادہ ہونے کی بناء پر تخلیقِ کائنات سے پہلے اپنے بندوں کو اختیارات اور آزادی دینے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کا نام قدر ہے اور اس اندازے پر مبنی علم کے اظہار کا نام قضاء ہے۔ اس کو مثال کے ذریعے سمجھا جائے۔

مثلاً کوئی تجربہ کار استاد اپنے شاگردوں میں سے کسی ایک شاگرد کو کہہ دے کہ تو ضرور فیل ہو گا اور سال کے بعد وہ فیل ہو جائے تو کیا طالب علم کا فیل ہو جانا استاد کی پیشگوئی کی وجہ سے ہونا ہے یا اپنے محنت نہ کرنے کی بناء پر۔ ظاہر ہے استاد کا اعلان طالب علم کے مستقبل کو متاثر نہیں کر سکتا امر واقع یہ ہے کہ طالب علم محض اور محض اپنی نالائقی اور بے توجہی کی وجہ سے فیل ہوا ہے۔ اگر وہ محنت کرتا تو اسے یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا البتہ استاد کا پہلے بتا دینا اس کے کمالِ علمی اور مہارت تامہ کی دلیل ہے۔

قضاء معلق اور قضاء مبرم

اللہ رب العزت نے انسان کے کسب و عمل کی نسبت پہلے سے اندازہ مقرر فرما لیا ہے اور قضاء کی صورت میں اس کا اظہار بھی فرما دیا ہے لیکن انسان کا تکمیل کار کی آخری گھڑی تک اپنے اس کام کو کرنے یا نہ کرنے کا اختیار باقی رہتا ہے ۔ وہ اگر چاہے تو اپنی نیت کو بدل سکتا ہے اپنے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک سکتا ہے اور اللہ رب العزت کا بھی انسان سے وعدہ ہے ۔ کہ اگر کوئی بندہ بدلنا چاہے تو اس کے بدلنے والے ارادے اور نیت کے ساتھ ہی اس کی تقدیر بھی بدل دیں گے ۔

یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتٰبِ ۔ (الرعد) ۱۳/۳۹

"اللہ جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور لوح محفوظ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے ۔ لوحِ محفوظ میں ماکان مایکون کے احوال اور کیفیات کا اندراج ہوتا ہے اور اللہ رب العزت اس اندازے میں تبدیلی کرتا رہتا ہے ۔ یہ عام طور پر قضاء معلق کی صورت میں ہوتا ہے انسان خود کو بدلنا چاہے تو اللہ رب العزت اس کی خاطر اپنے اندازے اور اپنی مقرر کردہ تقدیر میں تبدیلی فرما دیتا ہے ۔

شبہ کا ازالہ

یہاں پر یہ بات بھی ذہن نشین رہے معاذ اللہ اللہ رب العزت کا علم انسان کے اعمال کی نسبت غلط بھی نہیں ہو سکتا بلکہ لکھی ہوئی تقدیر کا مٹایا جانا اور اس میں لکھا جانا یہ دونوں پہلو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ تقدیر ایسے مسئلے کا نام نہیں جس میں یہ تبدیلی نہ ہو سکے وہ تو محض انسانی اچھائی یا برائی کا ایسا علم ہے جس میں موقع بموقع تغیر و تبدل ہو سکتا ہے ۔ بشرطیکہ انسان اس تبدیلی کی طرف مائل ہو ۔

ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ کے ذہنوں میں مسئلہ تقدیر کی نسبت کچھ شکوک و شبہات پیدا ہوئے کہ جو کچھ طے ہو چکا ہے وہ بدل نہیں سکتا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا :

افلانتوکل "کیا ہم اپنی تقدیر پر بھروسہ نہ کریں "۔

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ سلم نے ارشاد فرمایا:

جف القلم بما انت لاق "جو کچھ تمہیں ملنے والا ہے اسے قلم لکھ کر خشک ہو چکے ہیں ۔"

مفہوم حدیث یہ ہے کہ خدائی علم اور نوشتہ تقدیر نے انسان کو مجبور نہیں کیا بلکہ انسان کو تگ و دو اور جدوجہد کے ساتھ اپنے مقدر کو تلاش کرنے کی اجازت دی ہے ۔ عمل کا اختیار دیا ہے اسے کسبِ خیر کی تلقین فرمائی ہے ۔ انسان کا عمل کئے بغیر اپنے مقدر کا بیٹھے رہنا عبث و فضول ہے کیونکہ انسان اپنی تقدیر، اپنے اعمال و افعال سے ہی لکھتا ہے ۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو بڑے اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوہ تقدیر یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

انسان کو تقدیری فیصلوں نے مجبور نہیں کیا بلکہ اختیار جیسی نعمت سے نوازا ہے برے اعمال و افعال کی ذمہ داری انسان پر ہی ہے ۔ مسئلہ تقدیر پر اعمال ٹالتے رہنا کوئی حقیقت نہیں ہے ۔ مولانائے روم نے اس موضوع کو واضح کرنے کے لئے دو حکایات بیان فرمائی ہیں جس کے تصور میں تقدیر کا رونا ختم کیا جا سکتا ہے فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ چور کو شاہی پیادے پکڑ کر کوتوال کے پاس لائے اور بتایا کہ اس شخص کو ہم نے چوری کرتے ہوئے موقع پر گرفتار کیا ہے کوتوال نے چور سے پوچھا "تو نے چوری کی ہے؟"

اس نے جواب میں کہا کہ چوری میں نے کی ہے ۔ لیکن اللہ رب

العزت کے حکم سے کی ہے تو جانتا ہے کہ کائنات کا ایک ذرہ بھی خدا کے حکم سے باہر نہیں ہے یہ سن کر کوتوال نے پیادوں سے کہا کہ اسے درخت سے الٹا لٹکا کر اتنا مارو کہ کھایا پیا سب بھول جائے۔

یہ حکم سنتے ہی چور نے گڑگڑانا اور رونا شروع کر دیا تو کوتوال نے کہا اب کیوں روتا ہے؟ یہ کام بھی خدا کے حکم ہی سے کر رہا ہوں"۔

اسی طرح ایک شخص بغیر کسی اجازت کے باغ میں جا گھسا اور درخت پر چڑھ کر پھل توڑنے لگا۔ اتنے میں باغ کا مالک ادھر آنکلا اور اس شخص کو پھل توڑتے دیکھ کر بولا:

"ارے او بے حیا یہ کیا حرکت ہے؟ پھل توڑنے والے نے جواب دیا۔"

اگر اللہ کے باغ سے اللہ کا بندہ اللہ رب العزت کی پیدا کی ہوئی کھجور توڑ کر کھائے تو اس میں بے حیائی کی کون سی بات ہے۔ اللہ رب العزت کی لازوال نعمتوں پر سانپ بن کر بیٹھنے والا تو کون ہے"۔ یہ سن کر باغ کے مالک نے اپنے نوکر سے کہا:

کوڑا لے آؤ تاکہ میں اللہ کے اس بندے کو جواب دوں"۔ غلام دوڑا دوڑا کوڑا لے آیا۔ باغ کے مالک نے چور کو اسی درخت سے باندھا اور اس کی پیٹھ پر کوڑے برسانے شروع کر دیئے۔ چور نے کہا "ارے بھائی کچھ تو خدا کا خوف کرو کیا مجھے مار ڈالے گا؟" اس نے جواب دیا "چپ مت"۔ اللہ کی پیدا کی ہوئی لکڑی سے اللہ کا ایک بندہ اللہ کے دوسرے بندے کو مار رہا ہے"۔

آخر اس چور نے اپنے عقیدے سے توبہ کی اور اقرار کیا کہ بے شک انسان کو قوت اختیار حاصل ہے۔

مولانائے روم دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

جبر بودے کے پشیمانی بودے
ظلم بودے کہ نگہبانی بودے

جبر ہوتا تو پشیمانی کب ہوتی
اور ظلم ہوتا تو نگہبانی کب ہوتی

مطلب یہ ہے جبر ہوتا اور بندے کو اعمال و افعال کرنے کا اختیار نہ ہوتا تو پھر مقافات پر پشیمانی کب ہوتی ہے افسوس یہ کیوں ؟ کیا انسان سمجھتا کہ میں مجبور تھا میں کیا کروں جو ایسا ہو گیا ۔ پس پشیمانی ہونے کی وجہ سے معلوم ہوا بندہ اعمال و افعال میں مجبور نہیں ہے بلکہ مختار ہے اسی طرح اگر ظلم ہوتا تو اللہ رب العزت نگہبانی کیوں فرماتے کہ کہیں حفاظت کے لئے فرشتے مقرر کئے جاتے ہیں اور کہیں حفاظت کے لئے اعضاء دیئے جاتے ہیں ۔

خلقِ افعال پر شبہ کا ازالہ

مسئلہ خلق افعال پر بھی بعض لوگوں کو شبہ لاحق ہوتا ہے کہ جب سب کچھ اللہ رب العزت نے پیدا کیا ہے اور انسان کا جملہ اعمال و افعال کا بھی وہی خالق ہے ۔ تو پھر انسان کے لئے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا کیا کوئی اختیار رہ جاتا ہے

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ انسان مختار بھی ہے اور مجبور بھی اس کو سمجھنے کے لئے اس امر کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے کہ دو قسم کے امور ہیں ۔

۱۔ امور تکوینیہ ۔
۲۔ امور تشریعیہ ۔

امور تکوینیہ کی تشریح

امور تکوینیہ کی تعریف میں وہ چیزیں آتی ہیں جو اللہ رب العزت کے اشارہ لفظ کن سے وجود میں آتی ہیں اور انسان کی مشیت اور ارادہ کا اس میں ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہوتا جیسے پیدائش ، موت ، مصیبت ، راحت ،

صحت، بارشوں کا ہونا، آندھیوں کا چلنا، سمندر میں طوفانوں کا اٹھنا، سورج کا طلوع و غروب۔ یہ سب امور تکوینیہ ہیں جن میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں ان امور میں انسان مجبور ہے اللہ رب العزت نے مختلف مقامات پر اس حقیقت کو قرآن مجید میں واضح فرمایا ہے۔

۱۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا۔ (الانعام: ۲:۷)

"وہ اللہ رب العزت ہی کی ذات ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے پھر تمہاری زندگی کے لئے ایک وقت مقرر ہے"۔

۲۔ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُعَمَّرٍ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ۔ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ۔ (فاطر: ۲۲:۱۱)

"اور کسی عورت کو حمل یا وضع حمل نہیں ہوتا لیکن خدا کے علم سے اور نہ کسی شخص کو درازی عمر ملتی ہے یا کوتاہی عمر لیکن وہ لوحِ محفوظ میں ہے۔ بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کے لئے آسان ہے۔

۳ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا۔ (آل عمران: ۴:۱۱۰)

"کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی اجازت کے بغیر مر سکے ہر شخص کی زندگی کی ایک میعاد مقرر ہے"۔

۴ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ۔ (ال عمران: ۴:۱۵۲)

"منافقین کہتے تھے کہ ہماری بات مان لی جاتی تو ہم یہاں مارے نہ جاتے"۔ آپ کہیئے اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن پر یہاں مرنا لکھا جا چکا تھا وہ از خود اپنے مقتل کی طرف نکل کر چلے آتے۔

۵ أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ۔ (النساء: ۵:۷)

"تم جہاں بھی رہو تم کو موت آ کر پالے گی اگرچہ تم مضبوط اور مستحکم قلعوں میں کیوں نہ ہو؟"

۶ مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ۔ (الحدید: ۲۷:۲۲)

"نہ کسی ملک میں کوئی آفت آتی ہے نہ اس کے باشندوں میں، مگر وہ آفت لوحِ محفوظ میں ان کی پیدائش سے پہلے مکتوب ہوتی ہے۔ اور یہ بات اللہ رب العزت پر بے حد آسان ہے یہ اس لئے بیان کیا ہے تاکہ جو نعمت تمہارے پاس سے چلی جائے اس سے غم نہ کرو اور جو مل جائے اس پر اترایا نہ کرو بلاشبہ اللہ رب العزت شیخی خوروں کو پسند نہیں فرماتا"۔

(۷) "اَوَلَمْ یَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ۔ (الروم: ۲۱: ۹)

"کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ اللہ رب العزت جس شخص پر چاہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس شخص پر چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔"

۸ ھُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِہٖ نَبَاتَ کُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْہُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْہُ حَبًّا مُّتَرَاکِبًا۔ (الانعام: ۷: ۹۹)

"وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے آسمان سے بارش نازل کی پھر اس پانی کے سبب سے زمین سے لہلہاتا ہوا سبزہ اور غلہ پیدا کیا۔"

۹ والذی قدر فھدی۔ (اعلیٰ: ۳۰)

"وہ جس نے تمام مخلوقات کے لئے ایک طبعی نظام مقرر فرمایا، پھر ہر ایک کو اس نظام کے مطابق چلنے کی توفیق بخشی"۔

۱۰ وَجَعَلَ الَّیْلَ سَکَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ۔ (الانعام ۷: ۹۶)

"اور اس نے رات کو سکون کا ذریعہ بنایا اور سورج اور چاند کا ایک حساب مقرر کیا (ان دونوں اجرام کا نظام) ایک زبردست اور ہمہ دان ہستی کا مقرر کیا ہوا ضابطہ ہے۔

۱۱ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰہُ مَنَازِلَ۔ (یٰسین: ۲۳: ۳۹)

"اور ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کیں"۔

۱۲ واللّٰہ یُقَدِّرُ اللیل والنھار (مزمل: ۲۹: ۲۰)

"رات اور دن کا ضابطہ اللہ تعالیٰ ہی بناتا ہے"۔

مندرجہ بالا امور جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں ان کے وجود

میں انسان کا کوئی دخل نہیں اور ان میں وہ مجبور ہے۔

امور تشریعیہ

امور تشریعیہ وہ ہیں جن کی بجا آوری کے ساتھ اللہ رب العزت نے انسان کو مکلف اور پابند کیا ہے۔ اللہ رب العزت نے خیر اور شر دونوں کو پیدا کیا ہے۔ اور دنیا میں شر پر ابھارنے کے لئے شیطان کو پیدا کیا اور خیر پر برانگیختہ کرنے کے لئے آسمانی کتابوں اور انبیاء و رسل کو مبعوث فرمایا۔ اور انسان کے اندر بھی دو قوتیں رکھیں کہ ایک قوت وہ ہے جو اس کو نیکی پر ابھارتی ہے جو لمہ رحمان یا عرف عام میں ضمیر سے تعبیر کرتے ہیں اور ایک وہ قوت ہے جو اس کو شر پر اکساتی ہے جس کو لمہ شیطان یا عرف عام میں ہمزاد کہتے ہیں۔

اس کے بعد اس کو عقلِ سلیم دی تاکہ وہ خیر و شر کے درمیان اپنے لئے راستہ منتخب کر سکے۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے فرمایا:

۱ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ۔ (البلد: ۳۰)

"ہم نے انسان کو خیر و شر کے دونوں راستے دکھا دیئے"۔

۲ مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (الکہف: ۱۵:۹)

"جو چاہے اللہ پر ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر کرے"۔

۳۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا۔ (الجاثیہ: ۱۵:۲۵)

"جو نیک عمل کرے اس کا نفع اس کو ملے گا اور جو بدی کرے گا اس کا ضرر بھی اسی کو پہنچے گا"۔

اسی طرح کی تمام قرآنی آیات کا مفاد یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے انسان کو ایمان اور کفر نیکی اور بدی دونوں راستے دکھا دیئے ہیں اور ان کے انجام سے بھی واقف کر دیا ہے اور عقلِ سلیم بھی دے دی ہے کہ وہ ایمان اور کفر، نیکی اور بدی میں سے جو راستہ چاہے منتخب کرے۔ اگر انسانی عقل کے لئے یہ اختیار نہ مانا جائے تو نہ صرف بداہتِ عقل کے خلاف ہے بلکہ قرآنی نصوص کے بھی خلاف ہے۔

اگر انسانی عقل کو اپنے لئے بھلائی اور برائی کے خلاف کی قدرت نہ ہو تو انبیاءؑ اور رسل کا مبعوث ہونا اور آسمانی کتابوں اور صحائف کا نازل ہونا سب عبث اور فضول قرار پائیں گے۔ اور یہ اللہ رب العزت کی حکمت کے خلاف ہے۔

ایک انسان کو قطعی طور پر کسی کام کے کرنے کے لئے مجبور اور بے دست و پا کرنے کے بعد اس سے اس فعل پر مواخذہ کرنا بظاہر وہ ظلم ہے جس سے اللہ رب العزت نے اپنی براءت بیان فرمائی ہے:

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ۔ (حٰمٓ السجدہ: ۴۶:۲۴)

"اللہ رب العزت اپنے بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں ہے"۔

اللہ رب العزت نے فرمایا:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ (البقرہ: ۲۸:۳)

"اللہ رب العزت کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کرتا جو شخص نیکی کرے گا تو اس کا نفع اس کے لئے ہے اور اگر برائی کرے گا تو اس کا ضرر بھی اسی کو پہنچے گا۔

قرآنی مفہوم انسان کے مجبور ہونے کی تردید کر رہا ہے کہ انسان مجبور نہیں ہے بلکہ اس کو نیکی یا بدی اختیار کرنے کا موقع اور اختیار دیا گیا ہے اگر انسان پتھر کی طرح بے اختیار و مجبور ہوتا تو اس کو نیکی کرنے اور برائی سے بچنے کا حکم دینا۔ اس کی طاقت اور وسعت سے بڑھ کر اس کو مکلف کرنا ہوتا۔ اور قرآن مجید واضح طور پر فرماتا ہے کہ اللہ رب العزت کسی شخص کو بھی اس کی طاقت سے زیادہ تعمیل کا حکم نہیں دیتا۔ کیونکہ طاقت کے بغیر مکلف کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے نوکر کو سودے لینے کے لئے دکان پر بغیر رقم کے بھیج دے۔ جب دکان پر سودا طلب کرے تو رقم نہ ہونے پر دکاندار سودا واپس کر لے کیونکہ بغیر رقم کے سودا ملنا ناگزیر ہے۔

پس اسی طرح بغیر اختیار کے مکلف ہونا بھی فضول و عبث ہوگا۔ لہٰذا انسان مجبور محض ہرگز نہیں ہے اس کو ایک مثال کے ذریعے سمجھیں:

مثلاً ایک بچہ کی خواہش ہے کہ آج باغ میں جا کر ساتھیوں کے ساتھ کھیلے اور کیف و سرور حاصل کرے لیکن اس کے والدین اس سے کہتے ہیں سکول جاؤ وہ نہیں جاتا تو اس کی خواہش کے برعکس اس کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اسکول لے جاتے ہیں اور بچہ کا یہ حال ہے کہ جب والدین کی گرفت ڈھیلی ہو تو فوراً باغ کی طرف دوڑتا ہے سو والدین پھر اس کو پکڑ کر زبردستی اسکول لے جاتے ہیں ۔ یہ بچے کے ساتھ کھلا ہوا جبر ہے ۔ اگر ہمارے ساتھ بھی یہی ہوتا کہ ہمارا دل تو چاہتا کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھیں اور کوئی ان دیکھی قوت زبردستی ہماری خواہش کے خلاف ہمیں شراب خانہ لے جا کر شراب پینے پر مجبور کر دیتی تو یہ جبر ہوتا حالانکہ یہ امر واقع نہیں ہوتا۔ بلکہ جب ہماری خواہش نماز کی ہوتی ہے تو ہم نماز پڑھتے ہیں اور جب ہماری خواہش نماز کے وقت سونے یا کھیلنے کی ہوتی ہے تو ہم سوتے یا کھیلتے ہیں اور جب ہر عمل ہماری خواہش پر ہی مرتب ہوتا ہے تو جبر کہاں رہا

حقیقتاً انسان مجبور نہیں ہے ۔ اور اس کا ہر قول و عمل اس کے اختیار و انتخاب پر مرتب ہوتا ہے ۔ تو اللہ رب العزت کا اس سے باز پرس کرنا اور مواخذ کرنا اور جزاء و سزا کا مرتب کرنا ان میں سے کوئی چیز بھی خلاف عقل نہیں ہے ۔

اس لئے اللہ رب العزت نے فرمایا:

۱۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ (سورۃ زلزال۔ ۳۰

"جس شخص نے ایک ذرہ برابر بھی نیکی کی تو اس کی نیکی کا صلہ ملے گا اور جس نے ایک ذرہ برابر بھی برائی کی تو اس کی سزا بھگتے گا"۔

۲ ام حسب الذین اجترحوا السئیات ان نجعلھم کالذین امنوا وعملوا الصالحات سواء محیاھم ومماتھم ساء مایحکمون۔ (الجاثیہ: ۲۵: ۲۱)

"وہ لوگ جو برے کاموں کو دلیری سے کرتے ہیں کیا یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم ان کو نیکوکاروں کے برابر درجہ دیں گے ۔ خواہ زندگی ہو یا موت یہ ان کا قطعاً غلط فیصلہ ہے"۔

۳ وان لیس للانسان الا ما سعی وان سعیہ سوف یری۔ (النجم: ۴:۲۷)

"اور انسان کو صرف اس کی اپنی کوشش کا پھل ملے گا اور عنقریب اس کوشش کو دیکھ لیا جائے گا۔"

۴ والوزن یومئذن الحق فمن ثقلت موازینہ فاولئک ھم المفلحون ومن خفت موازینہ فاولئک الذین خسروا انفسھم بما کانوا بایاتنا یظلمون۔ (الاعراف: ۸:۸)

"روزِ حساب اعمال کا وزن یقینی ہے۔ پس جن کی نیکیوں کا وزن زیادہ ہو گا وہ کامیاب ہوں گے اور جن کی نیکیوں کا پلہ ہلکا ہو گا وہ خسارہ اٹھائیں گے کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔

کیا تقدیر پر تکیہ کرنا درست ہے

اپنی برائیوں کے جواز اور ان پر مواخذہ و گرفت سے بچنے کے لئے تقدیر پر تکیہ کرنا یا جبر کی آڑ لے لینا مثلاً

کہ قتل کرنا ہماری قسمت میں لکھا ہوا تھا اور مقتول کا میرے ہاتھوں قتل ہونا تقدیراً ہے۔ برائی سے بچنے کے لئے بڑے جتن کئے لیکن تقدیر جیت گئی اور برائی سرزد ہو گئی۔ ایسے عذر قابلِ معافی نہیں ہیں۔ ایسا تقدیر کا تکیہ روزِ محشر کفار بھی اپنی برات اور نجات کے لئے پیش کریں گے لیکن ان کا یہ عذر نہ سنا جائے گا نہ قبول ہو گا۔

چنانچہ اللہ رب العزت قیامت کے دن کفار کے قول کی حکایت کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرماتے ہیں: "کہ جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے فرشتوں کی عبادت کیوں کی؟ تو وہ کہیں گے"

وقالوا لو شاء الرحمن ما عبدناھم مالھم بذلک من علم ان ھم الا یخرصون۔ الزخرف: ۲۰:۲۵

"کہنے لگے اگر اللہ رب العزت چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے ان کو اس حقیقت کا علم نہیں یونہی اٹکل پچو سے باتیں کرتے ہیں۔

کیا شیطان کے سر بدی کا تھوپنا درست ہے

اور بعض لوگ اپنی برائیوں کو شیطان کے سر تھونپ کر آزاد ہو بیٹھتے ہیں کہ ہمیں تو شیطان نے یہ عمل کرایا۔ روزِ قیامت شیطان بھی ایسے لوگوں کو دھتکار دے گا۔

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ (ابراہیم:۱۳:۲۲)

"میرا تم پر کوئی زور تو نہیں تھا میں نے تم کو برائی کی دعوت دی تم نے قبول کر لی پس مجھ کو ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو"۔

شیطان کے سر اپنے اعمال تھوپنے والوں کو ایسے دھوکہ سے باز آجانا چاہیئے اور اپنے عقل و شعور اور احساس سے اپنے آپ کو بدلنا چاہیئے نہ کہ ہر وقت تقدیر کا رونا رونا چاہیئے۔ ایسے انسان کتنے بے شعور ہیں جو حال اور مستقبل کو ماضی کی طرح گزارنے پر اپنے آپ کو تقدیری مجبور سمجھتے ہیں حالانکہ اتنا بھی کیا جا سکتا ہے کہ (ماضی) جو ہو گیا گزر گیا۔ اسے تقدیر کہہ لیا جائے اور جو ہونا ہے اور آنے والا ہے اسے امکان کہہ دیا جائے تو آسانی کے ساتھ زوال عروج میں بدلا جا سکتا ہے۔ آنے والا بدل سکتا ہے کیونکہ ابھی آیا نہیں گزرا ہوا بدل نہیں سکتا کیونکہ وقت کا پہیہ واپس نہیں ہو سکتا۔ لہذا

اس تصور میں انسان زندگی کے دھاروں کو بدلنے کا تہیہ کر لے تو زوال و انحطاط کو عروج میں بدلا جا سکتا ہے۔ ماضی کو تقدیر اور حال کو فیصلے کا لمحہ اور مستقبل کو امکانات کا خزانہ تصور کیا جائے۔ تو زندگی کی تمام پریشانیوں کو راحتوں میں بدلا جا سکتا ہے اور اس سے ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھنے والی ناامیدی و مایوسی کا خاتمہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہماری بے یقینی و ناامیدی کی کئی وجوہات ہیں جن میں تقدیری فیصلوں کے بارے میں غلط فہمی اور مقصدِ زندگی کا نہ سمجھنا بھی اہم ترین وجوہ ہیں۔

تقدیر کے حوالے سے تو بحث کی جا چکی ہے اب مختصراً یقین کی

اہمیت پر کچھ عرض کرتا ہوں کیونکہ یقین ایک ایسی دولت ہے جو بے امیدی اور مایوسی کا خاتمہ کردیتی ہے۔

بے یقینی کیوں ہوتی ہے؟ اس کا یہی جواب ہوگا مقصد نہ ہو تو یقین کی حاجت نہیں رہتی اور مقصد نہ ہو تو عمل کا رُخ متعین نہیں ہو سکتا اس سے بے راہروی کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ سب سے پہلے مقصد متعین کیا جائے پھر اس کے حصول پر یقین کامل رکھا جائے تو زندگی کے مقصود کا حصول ناممکن نہیں ہے۔ یقین عمل کی بنیاد ہے۔ اللہ رب العزت نے یقین کو مقصود عبادت قرار دیا ہے۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (الحجر ۱۴: ۹۹)

"اتنی عبادت کر اپنے رب کی۔ یہاں تک کہ تجھے یقین حاصل ہو جائے"۔

یقین کی ضد شک ہے اور یہی شک تقدیر کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتی ہے کیونکہ شک عمل کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ شک سے ناامیدی و مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ جس سے انسان متزلزل ہو جاتا ہے۔ شک کو دور کرنے کی اتنی اہمیت ہے کہ اللہ رب العزت نے بھی آغاز قرآن

رحمت

معرفت

علم

سے نہیں کیا کہ یہ رحمت کی کتاب ہے یا معرفت کی کتاب ہے یا علم کی کتاب ہے۔ اس طرح کتاب کی اہمیت کو واضح نہیں فرمایا بلکہ فرمایا:

ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔

"یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے"۔

کیونکہ جب انسان شک سے بالاتر ہو جائے تو پھر انسان اپنے کمال کو پا سکتا ہے۔ یقین مل جائے تو آتش نمرود، فرعون و یزید کا مقابلہ کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ سب معرکے جن میں سب کچھ اسلام کے لئے لٹایا گیا وہ یقین ہی کے بل بوتے پر ہوا ہے۔ یقین کو ایمان سے اور شک کو کفر سے

بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

لہذا آخرت پر یقین رکھیئے کہ ہم نے اپنے کیئے اعمال کا جوابدہ ہونا ہے۔ تصورِ آخرت یقین کی حد تک عمل میں پیدا ہو جائے تو ناامیدی و مایوسی ختم ہو جاتی ہے۔ آیئے آج پروردگارِ عالم سے عہد کریں کہ ہم نے اپنی زندگی کے مقصد و مدعا کو سمجھنا ہے اور اس پر گامزن رہنا ہے۔ اللہ رب العزت بصدقہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مسئلہ تقدیر تاریخی تناظر میں

عہدِ رسالت مآبؐ اور مسئلہ تقدیر

تاریخِ اسلام میں جو مسئلہ سب سے زیادہ مناقشات کا موجب بنتا رہا ہے وہ مسئلہ تقدیر ہے۔ قدیم ادیان و مذاہب کے پیروکار بھی اسی مسئلہ میں الجھے رہتے تھے مشرکینِ مکہ بھی طبع آزمائی کرتے اور اسی بل بوتے پر وہ اپنے شرک کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ڈال دیتے تھے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

لَوْشَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ (الانعام۔ ۶: ۱۴۸)

"اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے اور کسی چیز کو اپنی مرضی سے حرام نہ ٹھہرا سکتے"۔

اللہ تعالیٰ نے مشرکینِ مکہ کی ذہنیت مشرکانہ کو بیان کرتے ہوئے آگے فرمایا:

كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰی ذَاقُوْا بَاْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ (الانعام: ۶: ۱۴۸)

"اسی طرح جھٹلایا تھا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے یہاں تک کہ انہوں نے ہمارا عذاب چکھا آپ فرمائیں کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے؟ (اگر) ہے تو اسے ہمارے سامنے لاؤ تم (یقین کو چھوڑ کر) گمان کی پیری کرتے ہو اور تم محض غلط تخمینے لگاتے ہو"

آیت کریمہ سے ثابت ہوا کہ عہدِ رسالت مآبؐ سے پہلے بھی لوگ اس

مسئلہ کی نسبت غلط افکار وخیالات کی بناء پر نیست و نابود اور ہلاک ہوتے رہے ہیں۔

مشہور مفسرِ قرآن علامہ محمود آلوسیؒ تفسیر روح المعانی میں مذکور آیۃ کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"آیت کریمہ کا یہ معنی و مفہوم نہیں کہ مشرکین افعالِ قبیحہ سے معذرت پیش کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ تو سرے سے ان افعال کی قباحت کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ اس سے بڑھ کر وہ ان افعال کو نیک کاموں میں داخل سمجھتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ بتوں کی پوجا تقربِ خداوندی کا ذریعہ ہے جن جانوروں کو وہ حرام ٹھہراتے تھے ان کے نزدیک ان کی حرمت اللہ تعالی کی نازل کردہ تھی۔ اس بات سے دراصل ان کا مقصد و مدعا یہ ثابت کرنا تھا کہ جن افعال و اعمال کا وہ ارتکاب کرتے ہیں وہ بالکل حق و صداقت پر مبنی، جائز و مشروع اور موجب رضائے الٰہی ہیں۔ وہ دلیل یہ دیتے تھے کہ ہم نے یہ افعال اللہ تعالی کے ارادہ و مشئیت سے انجام دیئے ہیں اور مشئیت خداوندی امر و حکم کے مترادف ہے وہ کہتے تھے اللہ تعالی نے ہمیں ان کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے۔ منطقیانہ انداز میں ان کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے شرک و تحریم کا کام اللہ تعالی کی مشئیت و ارادہ کے ماتحت انجام دیا ہے اور جو کام اللہ تعالی کی مشئیت و ارادہ سے کیا جائے وہ پسندیدہ و لائق تحسین و آفریں ہوتا ہے لہذا ہمارے سب کام مستحسن و پسندیدہ ہیں۔"

قرآن مجید سے واضح ہوتا ہے کہ مشرکین مسئلہ تقدیر کو موضوع بحث بنایا کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف وہ احتجاج و استشہاد کیا کرتے تھے عہدِ رسالت مآبؐ میں منافق بھی مسئلہ تقدیر کی نسبت طرح طرح کے شکوک و شبہات اور وساوس پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے کیونکہ یہ منافق بظاہر تو مسلمانی کا دعوی کرتے اور بباطن کافر ہوتے لہذا ان کے خبث باطنی کا اظہار زیادہ تر مسئلہ تقدیر کی نسبت ہوا کرتا تھا۔ یہ منافق لوگ صحابہ کرامؓ میں بھی اسی مسئلہ کی نسبت وساوس پیدا کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تقدیر پر ایمان لانے کو واجب قرار دیا اور ساتھ ہی اس پر غور و فکر کرنے سے بھی روک دیا۔

حدیث جبرائیلؑ میں ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایمان کے متعلق پوچھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں، روزِ آخرت اور اچھی یابری تقدیر پر ایمان رکھیں۔

حضرت امام مسلمؒ مسلم شریف کتاب الایمان کے آغاز میں فرماتے ہیں:

"خود امام مسلمؒ اپنی مکمل سند کے ساتھ یحییٰ بن یعمر سے روایت کرتے ہیں کہ یعمر نے بیان کیا کہ سب سے پہلے تقدیر کا انکار کرنے والا معبد جہنی نامی شخص تھا جس کا قیام بصرہ میں تھا۔

یحییٰ بن یعمر کہتے ہیں کہ میں اور حمید بن عبدالرحمن حمیری، حج یا عمرہ کی غرض سے گئے اور ہم نے آپس میں کہا کاش ہماری ملاقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ میں سے کسی صحابیؓ سے ہو جائے اور ہم ان سے تقدیر کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ اتفاقاً ہماری ملاقات حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے اس وقت ہوئی جس وقت وہ مسجد میں داخل ہو رہے تھے۔ ان دونوں نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو اپنے حلقہ میں لے لیا اور گفتگو کی جس کا خلاصہ یہ ہے:

"عبدالرحمن نے کہا ہمارے ہاں کچھ ایسے لوگ ظاہر ہوئے ہیں جو قرآن مجید پڑھتے ہیں اور علمی مباحث کرتے ہیں ان کا اعتقاد یہ ہے کہ تقدیر کوئی چیز نہیں ہے اور جو کچھ بھی دنیا میں وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم سابق کے بغیر ابتداءً ظہور میں آتا ہے"۔

اس پر حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے فرمایا:

اذالقیت اولئک فاخبر ھم انی بری منھم وانھم بر آءمنی والذی یحلف بہ عبداللہ ابن عمر لوان لاحدھم مثل احد ذھباً فانفقہ ماقبل اللہ منہ حتی یومن بالقدر۔ رواہ المسلم

"جب ان لوگوں سے ملو تو ان سے کہنا کہ میں ان سے لاتعلق ہوں اور وہ مجھ سے اور عبداللہ ابن عمرؓ حلفیہ کہتا ہے کہ اگر ان لوگوں میں سے کوئی شخص احد پہاڑ جتنا سونا بھی خیرات کردے تو اللہ تعالیٰ اس کے اس عمل کو

اس وقت تک قبول نہیں کرے گا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ لے آئے"۔
اس پر حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اپنے والد حضرت عمر بن الخطابؓ کی روایت کو بیان فرمایا جو ہم اس سے پہلے نقل کر چکے ہیں۔ لہذا اس سے ثابت ہوا تقدیر کا اقرار گویا ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان و ایقان اور اس کے عالم الاشیاء ہونے پر یقین رکھنے کے مترادف ہے۔

تقدیر پر ایمان رکھنے والا اس حقیقت مسلمہ کا لسان و قلب سے اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تقاضوں کے مطابق روز اول سے ہر چیز کے بارے میں لکھ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تقدیر پر ایمان لانے کی بار بار ترغیب فرمایا کرتے تھے تاکہ منافقین کے وساوس سے کامل الایمان لوگ محفوظ رہ جائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد مسلمانوں کو قدیم مذاہب و ادیان کے لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع ملا تو ان میں دونوں طرح کے لوگ تھے کچھ لوگ تقدیر کو مانتے تھے اور کچھ انکاری تھے ایسے حالات میں تقدیر کے اقراری اور انکاریوں میں مناقشات و مجادلات ہوئے جس کی وجہ سے تقدیر کی نسبت شکوک و شبہات پیدا ہوگئے۔

عہدِ خلافت فاروقیؓ اور مسئلہ تقدیر

روایت میں ہے حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں ایک چور کو لایا گیا آپؓ نے چور سے چوری کی وجہ پوچھی کہ "تم نے چوری کیوں کی؟"
چور بولا "اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی تھا کہ میں چوری کروں"۔
"آپؓ نے اس پر حد نافذ کر دی اور کچھ مزید درے لگائے جب

حضرت عمر فاروقؓ سے مزید درے لگانے کی وجہ پوچھی گئی تو آپؓ نے فرمایا" اس کا ہاتھ تو چوری کے جرم میں کاٹا گیا اور درے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کا الزام دینے پر لگائے گئے۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ ایمان بالقدر کا عقیدہ حذر و اختیار کے منافی ہے۔ روایت میں ہے:

"حضرت عمرِ فاروقؓ کے زمانے میں ملک شام میں طاعون کی وبا پھیلی اس زمانے میں حضرت عمرِ فاروقؓ بھی شام گئے ہوئے تھے وبا کی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ نے وہاں سے نکلنے میں جلدی کی تو حضرت ابوعبیدہؓ نے فرمایا :

افرمن قضاء اللہ۔

"کیا آپ اللہ تعالیٰ کی قضاء سے بھاگتے ہیں"

آپؓ نے فرمایا:

افر من قضاء اللہ الی قدر اللہ۔

"میں اللہ تعالیٰ کی قضاء سے اس کی قدر کی طرف بھاگتا ہوں"۔

حضرت عمر فاروقؓ کے فرمان کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ قضاء تو فیصلے کا صرف اعلان ہے۔ اگر طاعون جیسا مہلک مرض کسی علاقے میں وباء کی صورت میں پھیل جائے اور میں کسی دوسرے علاقے میں پہنچ کر اس مرض سے بچ جاؤں تو میرا بچ جانا اللہ تعالیٰ کی تقدیر یعنی علم میں ہو گا۔ اس لئے فرمایا کہ طاعون کے فیصلے سے ہٹ کر میں اللہ تعالیٰ کے علم کی طرف جا رہا ہوں۔

"کیونکہ قضاء ایک امر الٰہی ہے مگر تقدیر پر انسان کو اختیار ہے"۔

گویا کہ ایمان بالقدر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسباب سے فائدہ نہ اٹھایا جائے

عہدِ خلافت عثمانیؓ اور مسئلہ تقدیر

روایت میں ہے : جن بلوائیوں نے حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت میں عملی حصہ لیا تھا وہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے آپؓ کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ جب بلوائی آپؓ پر پتھر پھینکتے تھے تو ساتھ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آپؓ کو پتھر مار رہے ہیں۔

"حضرت عثمان غنیؓ فرماتے"۔

"تم جھوٹ بولتے ہو اگر اللہ تعالیٰ پتھر مارتے تو اس کا نشانہ کبھی خطا نہ ہوتا ہے"۔ حالانکہ تمہارے کئی نشانے خطا ہو رہے ہیں"۔

ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب خیالات فاسدہ گمراہ لوگوں کے پیدا کردہ تھے۔

عہدِ خلافت مرتضویؓ اور مسئلہ تقدیر

لحمك لحمي جمسك جسمي (حدیثِ نبوی ﷺ)

"تیرا گوشت میرا گوشت ہے تیرا جسم میرا جسم ہے"۔

جناب علی المرتضیٰؓ کو ذات نبوتؐ سے اس قدر تقرب کا اعزاز نصیب ہونے کے باوجود بدنصیبی سے لوگوں نے جناب علی المرتضیٰؓ کو سکون و اطمینان کے ساتھ خلافت کرنے نہیں دی۔

تاریخی اوراق اس حقیقت کے غماز ہیں کہ جناب معاویہؓ نے جناب علی المرتضیٰؓ کو چین و آرام اور سکھ کا سانس لینے ہی نہیں دیا کہ یہ مظلوم خلیفہ رسولؐ

امن و سکون کے ساتھ دینِ اسلام کی ترویج و اشاعت کے لئے کام کر سکے۔ طرح طرح کے فتنے اور بغاوتیں کرنا شروع کر دیں اور آج نام نہاد ملاں بغض علیؓ میں اس قدر جل بھن گیا ہے کہ ایسی بغاوتوں کا نام کی حد تک بھی ہمارا ذکر کرنا گوارا نہیں کرتا ہم نے اس سلسلے میں اپنا موقف انوارِ نبوت میں درج کر دیا تھا۔ اس کے باوجود حبِ علیؓ کے جرم میں جس لقب سے بھی ملقب کر دیا جائے اسے اعزاز سمجھتا ہوں۔

خیر یہ تو باتوں میں بات نکلتی گئی اس پر تو خصوصی کتاب آنے والی ہے۔

"کیا حُب علیؓ و حسینؓ جرم ہے؟"

جس میں واضح کیا گیا ہے کہ خارجیت و ناصبیت نے ہی بغض صحابہؓ پھیلایا ہے نہ کہ حُبِ علیؓ و حسینؓ نے بغضِ صحابہؓ کی اشاعت کی ہے۔

میں مسئلہ تقدیر کا تاریخی پس منظر عرض کر رہا تھا جیساکہ عرض کر چکا ہوں کہ جناب علی المرتضیٰؓ کے دورِ خلافت میں اپنے اور بیگانوں سب کی کرم نوازیوں سے طرح طرح کی بغاوتوں اور فتنہ پروریوں کا دور تھا ان بغاوتوں اور فتنہ پروریوں کی بناء پر مسئلہ تقدیر اور زیادہ ابھرا اس مسئلہ کی نسبت لوگوں نے بڑی شدت اختیار کر لی تھی۔

"نہج البلاغہ شرح ابن ابی الحدید میں ہے:

"ایک بوڑھے شخص نے جناب علی المرتضیٰ کی خدمت میں عرض کیا:

"آپ یہ فرمایئے کہ آیا ہمارا یہ سفر (یعنی جنگ) کی طرف تقدیر خداوندی کے مطابق تھا"۔

جناب علی المرتضیٰؓ نے فرمایا:

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اور اس ذات کی جس نے دانے کو پھاڑ کر انگوریاں پیدا کیں اور روحوں کو پیدا کیا۔ ہم جہاں سے بھی گزرے اور جس وادی میں بھی اترے اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے ہی اترے"۔

یہ سن کر بوڑھے نے کہا:

"پھر مجھے اجر و ثواب کیونکر ملے گا"۔

جناب علی المرتضیٰؓ نے فرمایا:

"بوڑھے چپ رہ اس سفر میں اور اس سے واپس لوٹنے میں تمہیں بڑا اجر ملے گا"۔

تم کسی حالت میں بھی مجبور نہیں تھے۔ بلکہ یہ سفر تم نے اپنے ارادے سے انجام دیا۔

بوڑھا کہنے لگا

"کیونکر ایسا ممکن ہے کیونکہ ہم تو تقدیر کے چلانے سے چلے تھے"۔

جناب علی المرتضیٰؓ نے فرمایا:

"شاید تمہارا خیال ہے کہ تقدیر کی بناء پر کوئی شخص مجبور ہو جایا کرتا ہے اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر ثواب و عقاب وعد و وعید اور امر و نہی سب بے کار ہو کر رہ

جائیں اللہ تعالیٰ کی ذات نہ گنہگار کو ملامت کر سکیں اور نہ ہی نیکوکار کی تعریف کر سکیں"۔

نہ نیک اعمال انجام دینے والا بدکار سے افضل ہو اور نہ ہی بدکار نیکوکار کی نسبت مذمت کا زیادہ مستحق ہو۔

بوڑھے!

جو بات آپ کہ رہے ہیں یہ تو بتوں کے پجاریوں باطل حق و ثواب سے بے بہرہ قدریہ کا مقولہ ہے جو اس امت کے مجوسی ہیں اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے ہیں ان میں بندہ مختار ہوتا ہے۔ اس نے برے کاموں سے اس لئے منع کیا کہ لوگ برے افعال سے بچ جائیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو افعال کا مکلف بنایا ہے مگر انہیں آسانیاں بھی دی ہیں وہ زبردستی اطاعت پر مجبور نہیں کرتا اور نہ ہی مغلوب کو عاصی قرار دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو دنیا میں بے مقصد نہیں بھیجا اور نہ ہی زمین و آسمان کو بے کار پیدا کیا یہ تو کفار کا عقیدہ ہے۔ اور کفار دوزخی ہیں"۔

بوڑھے نے پوچھا

"وہ تقدیر کیا چیز ہے جس نے ہمیں چلنے پر مجبور کیا"۔

جناب علی المرتضیٰؓ نے فرمایا:

"تقدیر اللہ تعالیٰ کا امر ہے"۔ پھر آپؓ نے آیت تلاوت فرمائی:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔ بنی اسرائیل: ۱۵: ۲۳

"اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس کے سواء کسی کی عبادت نہ کیجئے"۔

یہ سن کر بوڑھا ہنسی خوشی چل دیا۔

جناب علی المرتضیٰؓ کے علاوہ لوگ آپس میں بھی اس مسئلہ پر بحث و مجادلہ و مناقشہ کی محافل سرگرم رکھتے تھے۔ ان مجادلات و مناقشات سے فکری اور نفسی علمی اضطراب بڑھتا ہی گیا۔ جناب علی المرتضیٰؓ نے ان مناظروں و مجادلوں کی بڑی مذمت فرمائی اور صحیح مسئلہ واضح فرمایا۔

جناب علی المرتضیٰؓ کے بعد جناب امام حسن نواسہ رسولؐ کو بھی سکون و

اطمینان کے ساتھ دین کی ترویج و اشاعت کا کام نہ کرنے دیا آخر کار چھ ماہ کے بعد نواسہ رسول ؓ کو بھی خلافت چھوڑنا پڑی جو چھوڑتے ہی ملوکیت میں بدل گئی۔ جناب معاویہ ؓ کے دورِ ملوکیت میں بھی مسئلہ تقدیر پر لوگوں کے آپس میں بحث و مجادلہ ہوا کرتے تھے جس سے مزید شکوک و شبہات لوگوں میں پیدا ہوتے گئے ۔

فلسفیانہ افکار و آراء سے مسئلہ تقدیر پر مناقشات و مجادلات

مسلمان جب رومیوں اور یونانیوں اور اہلِ ایران سے مل جل گئے تو مسلمانوں میں فلسفیانہ افکار نے رواج پانا شروع کر دیا ۔ یہ اقوام فلسفہ کی بڑی قدردان تھیں فارس کی طرح عراق میں بھی فلسفیانہ مدارس پائے جاتے تھے بعض عربوں نے ان مدارس میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کی ۔ مثلاً حارث بن کلاہ اور اس کا بیٹا نضر انہی مدارس کے تربیت یافتہ تھے جب ان ممالک میں اسلام پھیلا تو ان ممالک میں بڑے بڑے ماہر فلسفی تھے بعض مسلمانوں کو بھی فلسفہ کی تعلیم دیتے تھے ۔ ملک شام کے لوگ فلسفہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے ۔ فلسفیانہ افکار کے رواج پانے سے عقائد کی مباحث چھڑ گئیں ۔ بعض علماء نے یہ مسئلہ کھڑا کر دیا کہ "آیا صفات خداوندی عین ذات ہیں یا غیر ذات ؟"

"کیا کلام اللہ تعالیٰ کی صفت ہے یا نہیں ؟

کیا قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے یا نہیں ؟

اس طرح بہت سے اختلافی موضوعات پیدا ہو گئے ۔ پھر تقدیر کا مسئلہ چھڑا اور اس سے انسانی ارادہ کے مناقشات پیدا ہوئے کہ آیا انسان مختار ہے یا مجبور ؟

مسئلہ تقدیر انسانی ارادہ و قدرت کی حیثیت ، اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ [illegible] قدرت کی حقیقت یہ وہ مسائل تھے بعض اہلِ علم نے صحابہ کرام ؓ کے دور میں [illegible] شروع کر دیا تھا ۔ علماء کا ایک فریق اس بات کا دعوی دار تھا کہ انسان [illegible] کا خالق نہیں ہے اور جو افعال انسان کی طرف بظاہر منسوب ہیں ان سے [illegible] نہیں ۔

[illegible] مذہب کا مرکزی نقطہ نگاہ یہ تھا کہ بندے سے افعال کی نفی کر کے

لیں اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف منسوب کر دیا جائے کیونکہ بندہ میں استطاعت نہیں
پائی جاتی وہ تو اپنے افعال میں مجبور محض ہے - نہ اس میں قدرت پائی جاتی ہے نہ
ارادہ اور نہ ہی اختیار - جیسے پتھر وغیرہ -

فرقہ جبریہ اور مسئلہ تقدیر

مجبور محض کا عقیدہ رکھنے والے فرقہ کا نام اس طرح جبریہ کہلایا - اللہ تعالیٰ
انسان میں افعال کو ایسے پیدا کر دیتا ہے جیسا کہ سب جمادات میں اور مجازی طور پر
وہ افعال انسان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں جس طرح جمادات کی طرف - مثلاً

آپ کہتے ہیں "درخت پھل لایا"، "پانی جاری ہوا"، "پتھر نے حرکت کی"،
"آفتاب طلوع ہوا"، "آسمان پر بادل چھا گئے"، "بارش ہونے لگی"، "زمین گھاس
سے ہری بھری ہو گئی" وغیرہ وغیرہ -

پس ثابت ہوا کہ جزا و سزا بھی ایک قسم کا جبر ہے جب عقیدہ بالجبر ثابت
ہو گیا تو تکلیف بالاعمال بھی جبر ہے - محدث ابن حزم جبریہ کے زعم کے مطابق
ان کے دلائل نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"جب اللہ تعالیٰ کی ذات فعال ہے اور یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ کوئی چیز اس
کی مثل و نظیر نہیں تو دوسرا کوئی شخص فعال نہیں ہو سکتا جبریہ کہتے ہیں" - افعال کی
نسبت انسان کی طرف اسی طرح ہے جیسے کہا جائے :

مات زید - "زید مر گیا" -
قام البناء "عمارت قائم ہو گئی -

"حالانکہ اسے اللہ تعالیٰ نے مارا اور عمارت بھی اسی نے قائم کی" -

فرقہ جبریہ کا بانی و موسس

عقیدہ جبر اموی دور کے اوائل میں پھلا اور پھولا اور اس نے آخری دور
میں ایک مذہب کی صورت اختیار کر لی - اس مذہب کا بانی و موسس جہم بن صفوان
تھا -

اموی عہد کے دو جلیل القدر اہلِ علم و فضل بزرگوں نے اس کی مذمت میں خطوط لکھے جن میں سے ایک خط حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ اور دوسرا خط حضرت حسن بصریؒ کا تھا جس کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ کا خط بنام فرقہ جبریہ

اما بعد

تم دوسروں کو تقویٰ و پرہیزگاری کا درس دیتے ہو۔ حالانکہ جب تقویٰ و پرہیزگار تمہاری وجہ سے گمراہ ہو گئے۔ اور گنہ گار تمہاری وجہ سے رونما ہوئے۔

اے اولادِ منافقین،
اے ظالموں کی پشت پناہی کرنے والو
تمہارے دم سے بدکاری کی مساجد آباد ہیں۔
تم سب اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والے ہو اور اپنے جرم اعلانیہ اللہ تعالیٰ پر تھوپ دیتے ہو۔

حضرت امام حسن بصریؒ کا خط بنام فرقہ جبریہ

حضرت امام حسن بصریؒ نے بصرہ کے جبریہ کے نام لکھا۔ لکھتے ہیں:

"اما بعد"

جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کی قضاء و قدر پر ایمان نہیں رکھتا وہ کافر ہے جو اپنے گناہوں کا بوجھ اللہ تعالیٰ پر ڈال دے وہ بھی کافر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت مجبوری کی وجہ سے نہیں کی جاتی اور نہ ہی کسی سے مغلوب ہو کر اس کی نافرمانی کی جاتی ہے۔

اس مالک حقیقی نے مالک بنا دیا ہے اور جو قدرت انسان میں پائی جاتی ہے وہ اسی کی ودیعت کردہ ہے اگر وہ نیک اعمال انجام دیں تو ان کے افعال میں مداخلت نہیں کرتا اور اگر برائی کا ارتکاب کریں تو وہ ان کے افعال میں مخل ہو سکتا ہے اگر اس کی مشیت کا تقاضا ہو۔

جب وہ کچھ نہیں کرتے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے چھوڑ دیا ہے اگر اللہ تعالیٰ مخلوقات کو اطاعت پر مجبور کر دیتا تو ثواب کو ساقط کر دیا ہوتا اور اگر جبراً گناہوں پر مجبور کرتا تو سزا کو موقوف کر دیتا اور اگر بے کار چھوڑ دیتا تو اس کی عدم قدرت کی دلیل ہوتی بلکہ مخلوقات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی خاص حجت ہے جسے اس نے انسانوں سے پوشیدہ و پنہاں رکھا ہوا ہے ۔ اگر وہ نیک اعمال کریں تو یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے اور اگر انسان برائی کا شیوہ اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ کی حجت ان پر تمام ہو جاتی ہے ۔ یہ خطوط اس حقیقت کے غماز ہیں کہ عہدِ سلف میں جبر کا عقیدہ رکھنے والے لوگ موجود تھے ۔

حضرت عبداللہ ابنِ عباس ؓ اور حضرت امام حسن بصریؒ نے ان کی تردید فرمائی اور ان کو اصل حقیقت سے آگاہ و آشنا کیا ۔

علی بن عبداللہ بن عباس سے روایت ہے ۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے والدِ گرامی کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی آیا اور کہنے لگا :

"ابنِ عباس ؓ! یہاں ایک قوم ہے جس کا دعویٰ ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جبراً گناہوں پر لگا رکھا ہے"

حضرت عبداللہ ابن عباس ؓ نے یہ سن کر فرمایا:

"اگر مجھے پتہ چل گیا کہ ایسا کوئی آدمی یہاں موجود ہے تو میں اس کا ایسا گلا دبوچوں گا کہ اس کی روح نکل جائے ۔ یہ مت کہو کہ اللہ تعالیٰ نے گناہوں کے ارتکاب پر انسانوں کو مجبور کیا ہے ۔ یہ کہنا بھی زیبا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے قطعی طور پر بے خبر ہے کہ بندے کیا کچھ کر رہے ہیں"۔ (والمنیۃ والامل)

جبریہ کا عقیدہ یہودی ذہن کی پیداوار ہے

اس سے قبل بیان ہو چکا ہے کہ عقیدہ جبر صحابہ کرامؓ کے دور میں پیدا ہوا بلکہ عہدِ رسالت مآب ؐ کے مشرکین بھی اس عقیدہ جبر کے قائل تھے ۔ جیسا کہ آغاز میں قرآن مجید کی آیت سے بیان کر چکے ہیں ۔

اموی دور میں اس عقیدہ کو مکمل مذہب کی شکل ملی اس کے انصار و اعوان تھے جو عقیدہ جبر کی طرف لوگوں کو دعوت دیا کرتے تھے اور مختلف مقامات

پر اس عقیدہ کی درس و تدریس ہوئی۔

۱۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس عقیدہ جبر کے اولین بانی یہود تھے انہوں نے وساوس کے ذریعے مسلمانوں میں پیدا کیا جس سے یہ آگے بڑھتا گیا یعنی بنیاد انہوں نے فراہم کی۔

۲۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے، کہ عقیدہ جبر کا موجد جعد بن درھم تھا جو مسلمان تھا اس نے شام کے ایک یہودی سے یہ عقیدہ جبر پڑھا اور اہل بصرہ میں جا کر اسے پھیلایا

پھر اس سے جہم بن صفوان نے سیکھا بہر حال اس کو مذہب کی شکل دینے والا اور اطراف اکناف میں پھیلانے والا جہم بن صفوان ہے اس وجہ سے اس کو بانی کہا جاتا ہے۔

حقیقتاً یہ عقیدہ جبر یہودی ذہن کی پیداوار ہے ۔ جس کا عہد رسالت مآبؐ میں آغاز ہو چکا تھا ۔ کیونکہ طالوت نامی یہودی آپ کا معاصر تھا اور یہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ تک بقید حیات رہا۔ جس کی وجہ سے یہ عقیدہ شکوک و شبہات کی صورت میں پھیلتا گیا۔

عقیدہ جبر کے نظریات اہل فارس میں بھی موجود تھے حضرت امام حسنؓ سے مروی ہے:

"کہ فارس کا ایک آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "کہ میں نے دیکھا ہے اہل فارس اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو اپنے نکاح میں لاتے ہیں اور جب ان سے اس کی وجہ پوچھی جاتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالی کی تقدیر یونہی تھی"

یہ سن کر آپؐ نے فرمایا:

"میری امت میں ایک ایسا فرقہ ہوگا جو اس کا قائل ہوگا اور یہ میری امت کے مجوس ہونگے۔

جہم بن صفوان بانی و موئس فرقہ جبریہ کے حالات

جہم بن صفوان جس نے عقیدہ جبر کو مذہب کی شکل دی یہ خراسانی الاصل اور بنی راھب کے موالی میں سے تھا سب سے پہلے یہ شریح بن حارثؓ کا کاتب تھا۔

پھر اس کے بعد شریح بن حارث سے مل کر نصر بن سیار کے خلاف خروج کیا مسلم
بن احوز مازنی نے بنی مروان کے آخری زمانہ میں اسے قتل کیا جہم بن صفوان نے
خراسان کو دعوت کا مرکز و محور بنایا تھا اس کے قتل کئے جانے کے بعد اس کے
پیروکار نہاوند میں مقیم تھے۔ پھر امام ابو منصور ماتریدی کا مسلک خراسان کے بلاد
کے دیگر تمام مذاہب پر چھا گیا اس کی تفصیلات آگے آرہی ہیں۔ یہاں پر جہم بن
صفوان کے دیگر عقائد کا تعارف کرانا خالی از فائدہ نہ ہوگا

جہم بن صفوان کے عقائد

جہم بن صفوان صرف عقیدہ جبر ہی کا بانی نہ تھا بلکہ اس کے علاوہ بھی اس
کے عقائد میں خرافات تھیں۔

1۔ اللہ تعالیٰ کو اشیاء میں داخل نہیں سمجھتا تھا اور نہ یہ کہتا تھا اور اللہ تعالیٰ زندہ
ہے وہ کہا کرتا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو ان اوصاف سے متصف نہیں کرتا جن
کا اطلاق حوادث پر ہو سکے

۲۔ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو قدیم نہیں بلکہ حادث تصور کرتا تھا اور اسی بناء پر وہ خلق
قرآن کا قائل تھا

۳۔ وہ بروز قیامت دیدار الٰہی کا منکر تھا

۴۔ ایمان کا نام صرف معرفت کہتا تھا اور کفر کو صرف جہل کا نام دیتا تھا

۵۔ جنت و دوزخ آخر فنا سے ہمکنار ہوگے۔

کوئی چیز دائمی و ابدی نہیں

قرآن مجید میں جس خلود کا ذکر ہے اس سے مراد طول مدت اور بُعد فنا
ہے دوام و بقاء نہیں۔

سنی و جبری کا فرضی مناظرہ

حافظ ابن قیم اپنی کتاب شفاء العلیل میں سنی و جبری کے مابین ایک فرضی
مناظرہ نقل کیا ہے اس سے ان کا مقصود بتانا یہ ہے کہ عقیدہ جبر کیا چیز ہے اور جبریہ
کس لئے شریعت کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ مناظرہ درج ذیل ہے

جبری کا اعتراض

"عقیدہ توحید کی صحت اسی صورت میں ثابت ہوتی ہے ۔ جب جبریہ کے عقیدہ کو تسلیم کیا جائے اس لئے کہ اگر جبر کے نظریہ کو نظر انداز کر دیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کے سواء حوادث کا فاعل کوئی اور بھی ہے ۔ اگر وہ چاہتا ہے تو افعال کو انجام دیتا ہے ورنہ نہیں ۔ یہ ایک ظاہری شرک ہے جس سے بچاؤ کا واحد طریقہ یہ ہے کہ جبر کے عقیدہ کو تسلیم کر لیا جائے"۔

اہلِ سنت کا جواب

"جبر کا نظریہ توحید کے منافی ہے اور احکام شریعت دعوتِ رسل اور ثواب و عقاب سے بھی ٹکراتا ہے اگر جبر کا عقیدہ تسلیم کر لیا جائے تو شرائع و احکام اور امر و نواہی اور ثواب و عقاب بے کار ہو کر رہ جاتے ہیں"۔

جبری کا اعتراض

آپ کا یہ کہنا نظریہ جبر امر و نہی اور ثواب و عقاب کے منافی ہے محلِ تعجب نہیں ہے کیونکہ لوگ پہلے سے کہتے چلے آئے ہیں ۔ تعجب انگیز قول آپ کا نظریہ جبر منافی توحید ہے ۔ حالانکہ نظریہ جبر عقیدہ توحید کا عظیم ترین مظہر ہے پھر اس کے منافی کیونکر ہو سکتا ہے ؟

اہلِ سنت کا جواب

عقیدہ توحید تو کلمہ طیبہ میں بیان کیا گیا ہے :

"لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ"

"نظریہ جبر اس کے منافی ہے"۔

"وجہ منافات و تضاد یہ ہے"

اس ذات کو کہتے ہیں جو جمیع صفاتِ کمال کی جامع ہو اور بندے خوف ورجاء ضروریات وحاجات اور جملہ امور میں اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

انبیاء کرامؑ جس عقیدہ توحید کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں وہ یہی ہے کہ صرف ذات واحد کے سامنے جھکنا ہے اور اظہار عجز ونیاز کرنا چاہیئے اس کی طاعات و مرضیات کو بجا لانے میں اپنی پوری کوشش صرف کرنا چاہیئے۔ بندہ کو چاہیئے کہ وہ اپنے مطلوب ومقصود پر اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو ترجیح دے۔

یہ تمام انبیاء کرام کی دعوت کا خلاصہ ہے۔ اسی کے پیشِ نظر ثواب و عتاب کا اہتمام کیا اور اس کی تکمیل کے لئے شرائع واحکام کو مقرر کیا اگر نظریہ جبر عقیدہ بنا لیا جائے تو معنی ہوگا کہ بندے میں نہ فعل کی قدرت پائی جاتی ہے نہ اس میں فعل کا کوئی نشان ہوتا ہے اور نہ وہ فعل کا مرتکب ہوتا ہے اس میں فعل کی قوت بھی نہیں پائی جاتی۔

لہذا اس کو حکم دینا بھی ایسے ہے۔ جیسے کسی بے بس انسان کو جو کچھ کرنے پر قادر ہی نہیں بلکہ یہ ایسے کاموں کے انجام دینے پر مامور ہے جن کی موجد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ان کاموں کے انجام دینے کا حکم دیا ہے۔ اور اسے ان کی ضد پر مجبور کیا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ بندے کو اعمال کا مکلف ومامور بنا کر خود ہی اپنے امر وافعال کی انجام دہی میں حائل ہو بیٹھا۔ اور اب بندے کو ان سے روکتا ہے اور بندہ کسی طرح بھی ان پر قادر نہیں۔

تم یہ کہتے ہو کہ بارگاہ خداوندی میں رسائی حاصل کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ مجلسی الفت ومودت اور ذوق وشوق سے اس کا قرب حاصل نہیں ہو سکتا حالانکہ توحید کا مفہوم عابد ومعبود کے باہمی رابطہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات محبوب ومودود نہیں ہے تو وہ الہ بھی نہیں ہوگا جس کی طرف قلوب انسانی شوق ومحبت اور الفت ومودت کے ساتھ متوجہ ہوں۔ اسی طرح جب بندہ فاعل و عابد اور محب نہ ہوا تو وہ عبودیت کی صفت سے عاری ہو جائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نظریہ جبر تسلیم کرنے اور اس کی محبت کو نہ ماننے سے توحید ضائع ہو کر رہ جائے گی۔ تم خود اس کا اعتراف کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ

بندے کو ایسے افعال کا حکم دیتے ہیں جن کے انجام دینے پر وہ قادر نہیں ہے اور ایسے کاموں سے روکتے ہیں جن سے وہ رک نہیں سکتا۔

پھر اللہ تعالیٰ بندے کو ناکردہ گناہوں پر اسے عذاب بھی دیتا ہے یا یوں کہیئے کہ جو کام اس نے خود انجام دیئے تھے ان کی سزا بندے کو دیتا ہے۔

جبری عقیدہ کو ماننے والو! تم لوگوں نے خود اقرار کیا ہے کہ اوامر کی عدم تعمیل اور منہیات کے ارتکاب پر سزا دینا یونہی ہے جیسے کسی انسان کو اس جرم کی سزا دی جائے کہ وہ اڑ کر آسمان تک کیوں نہ پہنچ گیا۔ یا اس نے پہاڑوں کو ان کی جگہ سے منتقل کیوں نہ کر دیا اور دریاؤں کے پانی کو اپنی گزرگاہ پر بہتا ہوا کیوں چھوڑ دیا یا بندے کو ایسے فعل پر سزا دی جائے جس سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

مثلاً یہ کہ فلاں چیز کا قد لمبا تھا یا چھوٹا کیوں ہے؟

یا فلاں چیز فلاں رنگ کی کس لئے ہے؟

اے جبریوں تم خود صراحتاً کہتے ہو کہ جس شخص نے ایک لمحہ کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی وہ اسے بھی شدید ترین عذاب میں مبتلا کر سکتا ہے اور یہ اس کی حکمت و رحمت کے منافی بھی نہیں بلکہ جائز ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ خود فرمائے کہ میں ایسا نہیں کرتا تو تم اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تمہارا قول ہے کہ بندے کو اعمال کا مامور و مکلف بنانا اسی طرح ہے جیسے اندھے کو لکھنے پر مجبور کرنا اور اپاہج و معذور کو اڑنے کی ترغیب دینا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جس شخص کو بھی اس عقیدہ کی دعوت دو گے وہ اللہ تعالیٰ سے متنفر ہو جائے گا۔ اور مقام تعجب یہ ہے کہ تم اپنے خیال کے مطابق اس عقیدہ سے توحیدِ خداوندی کا پرچار کر رہے ہو۔ حالانکہ اس سے تو توحید کا پودہ بیخ و بن سے اکھڑ کر رہ جاتا ہے۔

عقیدہ جبر کا شرعی احکام کے منافی ہونا بھی بڑی کھلی ہوئی بات ہے۔ شرائع و احکام اوامر و نواہی پر مبنی ہیں۔ یہ بات بڑی لغو ہے کہ حکم دینے والا اپنی ذات کو ہی کسی کام کا حکم دیتا ہے۔ اپنی ذات کو ہی ارتکاب فعل سے روکتا ہے۔ جب بندہ افعال کو انجام ہی نہیں دیتا تو اس سے طاعت و معصیت کا صدور کیونکر ہو گا بروز قیامت اچھے اور برے اعمال کا نتیجہ و ثمرہ جنت و دوزخ کی صورت میں ملے گا۔

جبریوں کا اعتراض

جب بندے سے کوئی حرکت صادر ہوتی ہے تو اس میں چار امکانات پائے جاتے ہیں۔

۱۔ وہ حرکت بقدرت خداوندی صادر ہوتی ہے۔
۲۔ صرف بندے کی قدرت اس کی موجب ہے۔
۳۔ وہ فعل دونوں کی قدرت سے انجام پاتا ہے۔
۴۔ اللہ تعالی اور بندہ دونوں کی قدرت کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

ان چاروں قسموں میں سے چوتھی قسم قطعی باطل ہے باقی تینوں قسموں میں سے ہر قسم کو علماء کا ایک گروہ درست تسلیم کرتا ہے۔ ہم جبریہ قسم اول کے قائل ہیں اسی کا نام جبر ہے۔

۲۔ دوسری قسم کو صحیح تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بعض اشیاء اللہ تعالی کی قدرت سے خارج ہیں لہذا اللہ تعالی جملہ اشیاء پر قدرت نہیں رکھتا اس کے برعکس عبد ضعیف کو ان پر قادر تسلیم کیا گیا ہے جن پر اللہ تعالی کی ذات قدرت نہیں رکھتی۔ اس عقیدہ کی بناء پر فرقہ قدریہ نے عقیدہ توحید کو ترک کر دیا اور مجوس کی طرح ہو گئے۔

۳۔ اگر تیسری قسم کو صحیح تسلیم کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ اللہ تعالی اور بندے کی مجموعی قدرت سے افعال ظہور پذیر ہوتے ہیں تو اس سے عبد و معبود کی شرکت لازم آتی ہے اور یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ایک فعل دو فاعلوں کے درمیان ٹھہر گیا یا ایک مقدر کے دو قادر اور ایک اثر کے دو موثر ہیں۔ اور یہ محالات میں سے ہے۔

محال ہونے کی وجہ

محال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دو موثر جب مستقل طور پر ایک اثر پر جمع ہو جاتے ہیں تو اثر دونوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اسے کسی کی بھی ضرورت نہیں رہتی اس کے ساتھ ساتھ وہ دونوں کا محتاج بھی ہوتا ہے لہذا اس سے لازم آیا کہ ایک ہی چیز دوسری کی محتاج بھی ہے اور اس سے بے نیاز بھی۔

اہلِ سنت کا جواب

شرعی دلائل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قدرت خداوندی جمیع ممکنات کو حاوی ہے۔

"وہ ذات ہوں صفات ہوں یا افعال"

کوئی چیز قدرتِ خداوندی سے باہر نہیں۔ شرعی دلائل سے یہ بھی ثابت ہے کہ بندہ اپنی قدرت و ارادہ سے اپنے کام انجام دیتا ہے یہ اس کے اپنے افعال ہوتے ہیں۔ جن کی بناء پر عقلاً عرفاً، اور شرعاً اس کی تعریف کی جاتی ہے۔ اچھے افعال ہونے پر تعریف اور برے اعمال ہونے پر مذمت کی جاتی ہے۔ یہ فطرتِ خداوندی ہے جس پر اس نے بندوں کو پیدا کیا ہے۔

دلیل سے یہ معلوم ہے کہ ایک عینی مفعول کا صدور دو مستقل فاعلوں سے محال ہے اسی طرح ایک عینی اثر دو مستقل موثروں سے صادر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح یہ بھی دلیل سے ثابت ہے کہ حادث کا محدث کے بغیر عالمِ وجود میں آنا محال ہے۔

اسی طرح وجہ ترجیح کے بغیر کوئی چیز راجح نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ امور ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسانی عقول میں پہلے سے ثبت کر رکھے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ عقلی براہین و دلائل میں نہ تعارض و تناقض ہوتا ہے نہ یہ باہم متصادم ہوتے ہیں۔ بلکہ تمام پر عمل کیا جاتا ہے اور یہ ایک دوسرے کے ممد و معاون ہیں۔ ان میں تعارض و تناقض اس شخص کو نظر آتا ہے جس کی بصیرت کمزور ہو اگرچہ وہ بڑا کثیر الکلام ہو اور اس کے ذہن میں شکوک و شبہات کی بھرمار ہو یہ ظاہر ہے کہ شکوک و شبہات کے علاوہ علم ایک جداگانہ چیز ہے۔ اسی وجہ سے خصوم و اعداء کے مابین تعارضات و تناقضات پیدا ہوئے۔

مسئلہ تقدیر کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اس قدرت و ارادہ سے حرکت کرتا ہے جو اسے اللہ تعالیٰ نے تفویض کر رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب بندے سے کسی فعل کو صادر کرانا چاہے تو اس میں اس فعل کی قدرت اور اس کا داعیہ پیدا کر دیتے ہیں۔ اس صورت حال میں بندے کے فعل کو اس کی طرف اس طرح منسوب کیا جاتا ہے جیسے سبب و مسبب کی طرف۔

اس کی نسبت قدرت خداوندی کی طرف اس طرح کی جاتی ہے جیسے مخلوق کی
خالق کی طرف اس سے ثابت ہوا کہ ایسے مقدور کا وقوع دو قادروں سے منع
نہیں جس میں ایک قدرت دوسرے کی قدرت کا نتیجہ و اثر ہو۔ یہ سبب کا ایک جزو
ہے اور دوسرے کی قدرت مستقل بالتاثیر ہے۔ اسے مقدور بین قادرین کے الفاظ
سے تعبیر کرنا مبنی بر فساد و فریب ہے کیونکہ یہ نظریہ رکھنے سے وہم پڑتا ہے کہ شاید
دونوں قادر قدرت میں مساوی ہیں۔
مثلاً:۔ جس طرح تم کہتے ہو:
"یہ کپڑا دو آدمیوں کی ملکیت ہے"۔
یا "اس گھر کی ملکیت میں دو آدمی شریک ہیں"۔
حقیقت بات یہ ہے کہ مقدور قدرت حادثہ کے باعث اسی طرح وقوع پذیر ہوتا ہے
جیسے مسبب سبب کی بناء پر معرض ظہور میں آتا ہے۔

سبب و مسبب اور فاعل و آلہ یہ سب قدرت کے اثرات ہیں اور قدرت
خداوندی تمام ممکنات پر حاوی اور مشتمل ہے۔ کوئی چیز دنیا میں مستقل بالتاثیر نہیں۔ اللہ
تعالیٰ کے سوا ہر چیز اس کی مخلوق ہے اور اس کی قدرت و مشیت کی کرشمہ سازی ہے۔
جو شخص ان حقائق ثابتہ کو تسلیم نہیں کرتا اسے اس بات کا اقرار کرنا چاہیئے کہ اللہ
تعالیٰ کے سوا کوئی اور بھی خالق ہے یا یہ کہ اس کائنات ارضی میں ایسی مخلوق بھی
موجود ہے جس کا کوئی خالق نہیں۔

جبریوں کا اعتراض

منکرین تقدیر کی رائے میں کافر کی جہالت و ضلالت اور کفر اللہ تعالیٰ کی
پیدا کردہ اور اس کے ایجاد و اختیار سے وجود میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ محالات
میں سے ہے۔ کیونکہ اس کے تسلیم کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
اس کے کفر کا ارادہ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کام اپنی مرضی سے انجام دیا جائے اس
میں قصد و ارادہ کا ہونا ضروری ہے جو محالات میں سے ہے اس لئے کہ کوئی عاقل
بذات خود ضلالت و جہالت اور کفر کا ارادہ نہیں کرتا لہذا وہ اس کا فاعل اختیاری بھی
نہیں ہو سکتا۔

اہلِ سنت کا جواب

اے عقیدہ جبر کے معتقدین!

مقامِ تعجب ہے کہ تمہارے نزدیک بندہ کفر و ظلم کا مرتکب نہیں ہو سکتا اس کے عین برخلاف تم کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ یہ سب کام انجام دیتا ہے۔ (یہ کھلا ہوا تضاد و تعارض ہے) تمہاری یہ بات بھی بڑی تعجب انگیز ہے کہ کوئی عاقل اپنے لئے کفر و ظلم کو پسند نہیں کرتا حالانکہ تم دیکھتے ہو کہ بہت سے لوگ حسد و بغض کی بناء پر حق آگاہ ہونے کے باوجود کفر و ضلالت کو اختیار کرتے ہیں ان کے مقتضیات کی پیروی کرتے اور ہدایت و رشد کے تقاضوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ وہ طریقِ ضلالت پر رواں دواں اور راہِ ہدایت کو دانستہ ترک کر دیتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

"جو بلاوجہ اس کائنات ارضی میں تکبر کرتے ہیں میں انہیں اپنی آیات سے پھیر دوں گا وہ تمام آیات کو بھی دیکھ لیں ان پر ایمان نہیں لائیں گے اور راہ ہدایت کو دیکھ کر اس پر چلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ البتہ وہ سرکشی و بغاوت کی راہ دیکھ کر اس پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں۔ اور ان سے غافل ہیں"۔

قرآن مجید کی دیگر بہت سی آیات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ کفار و مشرکین نے جان بوجھ کر کفر و ضلالت و شرک کو اختیار کیا تھا اور دنیا میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو کفر و شرک، ظلمت و تاریکی کو رشد و ہدایت سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا مناظرہ فرنگی سے ثابت ہوتا ہے کہ جبریوں کے ممکنہ اشکالات کا رد کر دیا گیا ہے اور واضح ہو گیا ہے کہ صحیح عقیدہ اہلسنت کا ہے جو عقلاً شرعاً درست ہے۔ اس مناظرہ کو علامہ ابن قیم نے اسی لئے نقل کیا ہے تاکہ جبریوں کے ممکنہ اشکالات کو رد کر کے اہل سنت کے موقف کو واضح کر دیا جائے۔ تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں آگاہ و آشنا ہو سکیں۔

فرقہ قدریہ اور مسئلہ تقدیر

فرقہ قدریہ کے مسئلہ تقدیر پر اشکالات و اوہام کو بیان کرنے سے پہلے مناسب ہو گا کہ فرقہ قدریہ کی مختصر تاریخ بیان کر دی جائے تاکہ معلومات میں اضافہ ہو جائے ۔ قدریہ کا نظریہ جبریہ کے بالکل برعکس ہے ۔

جبریہ انسان کو مجبور محض سمجھتے تھے اور ان کے برعکس قدریہ انسان کو کلی مختار مانتے ہیں گویا تقدیر کا انکار کر دیا اسی لئے تقدیر کا انکار کرتے ہوئے معبد بن خالد الجُہنی نے کہا :

"تقدیر وغیرہ کچھ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو حوادث کا علم اسی وقت ہوتا ہے جب وہ وقوع میں آتے ہیں "۔

اس تردید کا اصل مقصد ازلی علم و ارادہ کی نفی کرنا اور یہ ثابت کرنا تھا کہ انسانی افعال اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دائرہ سے باہر ہیں ۔

قدریہ کی وجہ تسمیہ

بعض مورخین نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ منکرین تقدیر ہونے کے باجود ان کو قدریہ کیوں کہا جاتا ہے ۔ اور بعض لوگوں کے نزدیک قدریہ کا نام ان کے عقیدہ کے برعکس طنزاً رکھا گیا ہے بعض مورخین کے نزدیک ان کو قدریہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے تقدیر کی نفی کر کے اسے بندے کے لئے ثابت کرتے ہیں ۔ ان کا مرکزی نقطہ نگاہ یہ ہے کہ ہر چیز انسان کے ارادہ و قدرت کی تابع ہے گویا ان کے نزدیک انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے ۔

بعض علماء کے نزدیک قدریہ کے عقائد و نظریات مجوس کے خیالات و نظریات سے قریبی مماثلت رکھتے تھے ۔ مجوسی خیر کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے اور شر کو شیطان کی طرف منسوب کرتے ہیں ان کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ شر کا ارادہ نہیں کرتا ۔

فرقہ قدریہ کا بانی و موسس

معبد بن خالد الجُہنی تقدیر کا منکر تھا اور اس نے اپنے نظریات کی عراق

میں خوب ترویج و اشاعت کی اور غیلان دمشقی بھی اس نظریہ کا حامل تھا اس نے
اپنے نظریات کی شام میں ترویج و اشاعت کی ۔ ان دونوں کو قدریہ کا بانی و موسس کہا
جاتا ہے ۔ کیونکہ ان دونوں کی ترویج و اشاعت سے قدریہ مذہب کی شکل اختیار کر گیا
اور ان کے کافی حامی پیدا ہو گئے ۔

غیلان دمشقی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ہمعصر ہے اس نے آپؒ کی
طرف خطوط بھی لکھے جس میں اس نے تقدیر کی تردید کی تھی ۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو مناظرہ کے لئے بلایا تو آپؒ نے ان
براہین و دلائل کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں ۔ جس سے وہ تقدیر کا قائل ہو گیا کچھ
عرصہ کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا انتقال ہو گیا ۔ وصال کے بعد غیلان دمشقی
دوبارہ قدری یعنی تقدیر کا منکر ہو گیا دوبارہ منکر ہونے کے بعد اس نے اپنے نظریات و
خیالات کی از سر نو پھر نشر و اشاعت کرنا شروع کر دی ۔

فارس و خراسان کو اس نے مسکن بنا لیا اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے
غیلان دمشقی کو مناظرہ کے لئے طلب کیا کہ وہ امام اوزاعیؒ سے مناظرہ کرے لہذا
امام اوزاعیؒ نے غیلان دمشقی سے مناظرہ کیا جو تاریخ کی کتب میں کچھ اس طرح درج
ہے ۔ امام اوزاعیؒ نے غیلان دمشقی سے مخاطب ہو کر فرمایا:

امام اوزاعیؒ: "یہ بتایئے اللہ تعالی نے جن باتوں سے منع کیا ہے کیا پہلے ان کا
فیصلہ کر رکھا ہے یا نہیں"؟

غیلان نے کہا: مجھے معلوم نہیں ۔

امام اوزاعیؒ: اب یہ بتایئے کہ کیا اللہ تعالی کسی بات کا حکم دے کر اس میں حائل
بھی ہو جاتا ہے ؟

غیلان دمشقی: مجھے معلوم نہیں ۔

امام اوزاعیؒ: کہ جن چیزوں کو اللہ تعالی نے حرام قرار دیا ہے ان میں سے کسی کی
مدد [illegible] نہیں ؟

غیلان دمشقی نے کہا کہ یہ بات پہلی دو باتوں سے بھی مشکل ہے لہذا یہ نہیں
جانتا ۔

امام اوزاعیؒ: اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے غیلان دمشقی کا فرار سنتے اس کی گردن اڑا دی۔

پھر ہشام بن عبدالملک نے امام اوزاعیؒ سے کہا۔

"ان تینوں سوالات کی خود وضاحت کیجئے"۔

امام اوزاعیؒ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ جس بات سے روکتے ہیں اسے انسانی تقدیر میں پہلے سے لکھ بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو جنت کے ایک مخصوص درخت کا پھل کھانے سے منع کیا۔ اس کے پہلو بہ پہلو ان کی تقدیر میں لکھ دیا تھا کہ وہ یہ پھل کھائیں گے چنانچہ انہوں نے یہ پھل کھا لیا۔

۲۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ حکم دے کر اس میں حائل بھی ہو جاتے ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ:

"ابلیس کو حکم دیا کہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کرے پھر اللہ تعالیٰ خود ہی حائل ہو گئے"۔

۳۔ کیا آپ نہیں جانتے؟ کہ اللہ تعالیٰ اشیاء کو حرام قرار دے کر پھر ان کے استعمال کرنے میں بندوں کی مدد بھی کرتے ہیں۔ مثلاً:

"مردار، خون، خنزیر کو حرام ٹھہرایا"۔

پھر اضطراری صورتوں میں ان کے استعمال کی اجازت بھی دی۔ امام اوزاعیؒ بہت بڑے عالم و فاضل اور محقق تھے جنہوں نے غیلان دمشقی پر سوالات کر کے جکڑ لیا۔ اگر وہ جواب دے بھی دیتا تو اس کے خلاف جاتے اس وجہ سے اس نے خاموشی میں اپنی خیر سمجھی وہ بھی اس کے لئے وبالِ جان بن گئی۔

غیلان دمشقی کے قتل ہو جانے کے بعد یہ مذہب (قدری) بصرہ میں صدیوں تک رہا۔ جس پر لوگ عمل کرتے رہے۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ مذہب معتزلی کے ساتھ بھی گھل مل گیا تھا۔

قدری اور سنی کا مناظرہ

علامہ ابن قیم اپنی کتاب "شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر والحکمۃ والتعلیل" میں سنی اور قدری کے مابین ایک فرضی مناظرہ نقل کیا ہے۔ جس میں قدریوں کے ممکنہ اعتراضات کے جوابات سنیوں کی طرف سے دیئے گئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلک اہل سنت ہی عقلاً و شرعاً درست ہے اس مناظرہ کا کچھ حصہ درج ذیل ہے۔

قدری: اللہ تعالیٰ نے اعمال کو بندوں کی طرف منسوب کیا ہے اور یہ نسبت بھی عام ہے اور خاص بھی۔ بعض مقامات پر استطاعت کے نقطہ نگاہ سے افعال کو بندوں کی طرف منسوب کیا۔ مثلاً قرآن میں ہے:

مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ۔ النساء ۴: ۲۵

"جو شخص تم میں سے پاکدامن اور مومن عورتوں سے نکاح کرنے کی وسعت نہ رکھتا ہو۔

۲۔ بعض جگہ مشیت کے اعتبار سے افعال کو بندوں کی طرف منسوب کیا:

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ۔

"تم میں سے جو سیدھا رہنا چاہے"۔

۳۔ کبھی ارادہ کی بناء پر جیسے حضرت خضرؑ کا قول:

فاردت ان اعیبھا۔

"میں نے اسے عیب دار کر دینا چاہا"۔

۴۔ کبھی فعل وکسب اور صنعت کے اعتبار سے:

بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ۔ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۔

۵۔ نسبت خاص سے مراد ایسے افعال کو بندوں کی طرف منسوب کرنا جیسے نماز، روزہ، حج، طہارت، زنا، سرقہ، قتل، کذب، کفر، فسق اور دیگر افعال۔ ان افعال کو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا ان کو صرف بندوں کی طرف منسوب کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں۔

روزہ

سُنی: تمہاری ان باتوں میں حق و باطل دونوں کی آمیزش ہے بے شک افعال کی نسبت بندوں کی طرف کرنا درست ہے۔ مگر یہ بات مکر و فریب پر بھی مبنی ہے کہ افعال کو بندوں کی طرف منسوب کرنے کی صورت میں ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی جا سکتی۔

اگر ان افعال کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ وابستہ نہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات ان کے ساتھ متصف بھی نہیں "۔ ان افعال کے احکام اللہ تعالیٰ پر ہمارے نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ان افعال سے مشتق اسما کا اطلاق ان پر درست ہے۔ تو یہ بات صحیح ہے اور یہ افعال ان وجوہ و اعتبارات میں سے کسی وجہ کی بناء پر بھی اس کی طرف منسوب نہیں کیے جا سکتے۔

اگر ان افعال کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ افعال اللہ تعالیٰ کے علم مقدر و مشیت عامہ اور تخلیق کی طرف بھی مضاف نہیں تو یہ سراسر باطل ہے وجہ بطلان یہ ہے کہ افعال کا صدور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے۔ تخلیق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اور اکتساب کی نسبت بندے کی طرف ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عمل کے آلات و قوی کے ساتھ ساتھ نفسِ عمل سے بھی نوازا جس کا خلاصہ یہ ہے:

"قوتِ عمل کو بازو اور کلام کو زبان کی طرف اسی طرح منسوب کیا جاتا ہے جیسے قوت سامعہ کو کانوں اور قوتِ باصرہ کو آنکھوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اسی طرح کلام اور قوت اخذ و بطش کی نسبت ان کے مصادر و مآخذ کی طرف کی جاتی ہے۔

اب آپ خود بتائیے!

کہ آیا قوی کے یہ مصادر و مآخذ و منابع قوی بنفسہا اور دیگر اسباب روئت و سماعت کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔ یا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم و کمال کی کرشمہ سازی ہے جو اس کائنات عالم کی تمام اشیاء کو وجود میں لائی۔

قدری: اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کے افعال کا خالق ہوتا تو اس کے اسماء بھی ان

افعال سے مشتق ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے لئے یہ نام تجویز کرنا اولیٰ و افضل ہوتے قائلین تقدیر کے نزدیک فاعل حقیقی کے اسماء ان افعال سے مشتق نہیں یہ عقل و منطق اور عرف ولغت کی عین خلاف ورزی ہے۔

سنی: بندہ حقیقتاً اپنے افعال کا فاعل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے افعال اور ان کے ظاہری باطنی آلات کو پیدا کیا۔ باقی رہا اسماء کا مشتق کرنا تو یہ اس کے لئے مشتق کئے جاتے ہیں۔ جو ان کا فاعل ہوتا ہے۔ مثلاً سارق، زانی کے اسماء کا اطلاق بندے پر کیا جائے گا کیونکہ وہی یہ سارے کام سرانجام دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فعل کا قیام جب فاعل کے ساتھ ہوتا ہے تو اس کا حکم بھی فاعل کی طرف لوٹتا ہے نہ کہ غیر کی طرف۔ اسی طرح فعل سے فاعل کے لئے نام اخذ کئے جاتے ہیں کسی اور کے لئے نہیں۔

قدری: اگر اللہ تعالیٰ افعال کا خالق ہوتا تو سب امور و افعال اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ وابستہ ہوتے۔ یعنی شرور و قبائح کی نسبت بھی لازم آتی ہے۔

سنی: یہ بے بنیاد و غلط دعویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندے میں جن افعال کو پیدا کیا ہے ان سے اللہ تعالیٰ کے اسماء مشتق نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے احکام اس کی طرف منسوب کئے جا سکتے ہیں۔ افعال سے انسان کے اسماء مشتق ہوں گے کیونکہ افعال کا قیام انسان کے ساتھ ہے اللہ تعالیٰ نے تو لاتعداد اشیاء مثلاً رنگہائے مختلف خوردنی اشیاء اور حرکات و سکنات کو بھی پیدا کیا ہے۔ مگر ان سے اس کے اسماء ماخذ و مشتق نہیں اور نہ ان کے احکام اس کی طرف لوٹتے ہیں۔ احکام کے لوٹنے سے مراد یہ بتانا ہے کہ وہ کھڑا ہوتا، بیٹھتا، کھاتا پیتا ہے"۔

معتزلہ کی تاریخ

اس فرقہ نے اموی عہد میں بال و پر نکالے اور عباسی دور خلافت میں عرصہ دراز تک اسلامی فکر پر حاوی رہا

بانی و موسس: اس فرقہ کا بانی و موسس واصل بن عطاء تھا یہ امام حسن بصریؒ کے حلقہ درس میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اس نے دوران درس حضرت امام

حسن بصریؒ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ گناہ کا مرتکب نہ مومن رہتا ہے اور نہ ہی کافر ہو جاتا ہے۔ بلکہ وہ ایمان اور کفر کے درمیان ہوتا ہے۔
حضرت امام حسن بصریؒ نے فرمایا:

ہولاء اعتزلوا۔
یعنی یہ لوگ اجماع اسلام سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس وجہ سے ان کا نام معتزلہ پڑ گیا۔

اور آپ نے اسے اپنے حلقہ درس سے دور کر دیا فرمایا اعتزل عنا ہم سے دور ہو جاؤ واصل بن عطا نے اپنے نظریات و افکار کی خوب اشاعت کی بلکہ اپنے نظریات کو مذہب کی صورت میں پیش کیا روایت میں ہے کہ جب حضرت امام حسنؓ جناب معاویہؓ کی خواہش اور بار بار اصرار اور مسلمانوں کو عظیم جنگ سے بچانے کے لئے خلافت سے دستبردار ہوئے تو اصحابِ علیؓ کی ایک جماعت سیاست سے بالکل کنارہ کش ہو گئی اور اس کی سرگرمیاں صرف عقائد تک محدود ہو کر رہ گئیں یہ گروہ معتزلہ تھا جنہوں نے حضرت امام حسنؓ سے اس لئے کنارہ کشی کر لی تھی کہ انہوں نے خلافت سے دستبرداری کیوں کی ہے؟ اس وجہ سے یہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر صرف عقائد کی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے اور انہوں نے اپنے افکار و نظریات کی خوب اشاعت کی۔

معتزلہ کے اصول خمسہ

اب ہم معتزلہ کے نظریات کا ذکر کرتے ہیں تاکہ ان کے نظریات سے آگاہی حاصل ہو سکے مورخین کے نزدیک معتزلہ کے اصول خمسہ مندرجہ ذیل ہیں۔
(۱) توحید (۲) وعد وعید (۳) کفر و اسلام کی درمیانی منزل کا اقرار (۴) عدل (۵) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔
اب ہم ایجاز و اختصار کے ساتھ ان پانچوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

توحید

حضرت امام ابوالحسن اشعریؒ اپنی کتاب مقالات الاسلامیین میں
توحید کے بارے میں معتزلہ کا مذہب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ ایک ہے۔ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَّھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (۴۲:۱۱)
نہ وہ جسم رکھتا ہے نہ کالبد نہ اس کا جثہ ہے نہ صورت، خون بھی نہیں گوشت بھی نہیں نہ جوہر ہے نہ عرض۔ نہ اس کا کوئی رنگ ہے نہ ذائقہ نہ خوشبو اسے چھوا بھی نہیں جا سکتا نہ اس میں حرارت ہے نہ برودت۔ نہ رطوبت نہ یبوست نہ طول۔ نہ عرض نہ عمق۔ نہ اس میں اجتماع ہے نہ افتراق، نہ متحرک نہ ساکت، نہ اس کے الگ الگ اجزاء ہیں۔ وہ جوارح واعضاء بھی نہیں رکھتا۔ وہ ذی جہات بھی نہیں نہ اس کا کوئی دایاں ہے نہ بایاں۔ نہ آگا ہے نہ پیچھا، اوپر بھی نہیں، نیچے بھی نہیں، کوئی مکان اس کا احاطہ نہیں کر سکتا، زمانہ اس پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ وہ جدا بھی نہیں اور ملا ہوا بھی نہیں۔ نہ وہ اماکن میں حلول کرتا ہے۔ وہ کسی ایسے وصف سے متصف نہیں کیا جا سکتا جو خلق میں پائے جاتے ہوں۔ اور حادث وفانی ہوں۔ نہ اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ متناہی ہے۔ اسے ناپا بھی نہیں جا سکتا وہ مختلف جہات میں سمایا ہوا نہیں۔ محدود بھی نہیں۔ نہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا۔ تقدیریں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ پردے اسے مستور نہیں کر سکتے وہ حواس کے ادراک سے بالا ہے۔ اسے لوگوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مخلوق سے کسی طرح مماثلت نہیں رکھتا۔ نہ اس پر آفات کا نزول ہو سکتا ہے نہ مصیبتیں اسے گھیر سکتی ہیں۔ ہر وہ بات جو تصور میں آسکتی ہے، ہر وہ تصور جو وہم میں آسکتا ہے اس کی مشابہت سے ماوراء ہے

وہ اول ہے۔ سابق۔ مقدم ہے۔ مخلوقات سے ماقبل موجود ہے وہ عالم ہے، قادر ہے، زندہ ہے، نہ اسے آنکھ دیکھ سکتی ہے نہ بینائی اس کا ادراک کر سکتی ہے۔ اوہام اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ سماعت اسے سن نہیں سکتی، صرف وہی قدیم ہے اور کوئی قدیم نہیں۔ وغیرہ وغیرہ (مقالات

الاسلامیین /۲۱۶)

معتزلہ کے عقیدہ کے نتائج

معتزلہ انہی اصول کے پیش نظر قیامت کے دن رویت باری تعالیٰ کو محال سمجھتے تھے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی جسمانیت اور جہت لازم آتی ہے۔ یہ صفات ذات سے غیر نہیں ورنہ تعدد قدماء لازم آئے گا اسی پر بنیاد رکھتے ہوئے وہ قرآن مجید کو مخلوق سمجھتے تھے کیونکہ وہ کلام کو اللہ تعالیٰ کی صفت قرار نہیں دیتے تھے مسئلہ خلق قرآن پر بہت مباحث ہوئے۔

۲۔ عدل

مورخ شہید المسعودی مروج الذہب میں عدل کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کا مطلب یہ ہے اللہ تعالیٰ فساد کو نہیں چاہتا نہ افعال العباد کو پیدا کرتا ہے لوگ اللہ تعالیٰ کے امر کو بجالاتے ہیں، اس کے منہیات سے رک جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ وہی حکم دیتا ہے جس کا ارادہ کرتا ہے۔ اور اسی بات سے روکتا ہے جسے برا سمجھتا ہے۔ ہر نیکی جس کا اس نے حکم دیا اس کے نزدیک پسندیدہ ہے اور وہ برا اور بری ہیں جس سے اس نے روکا ہے۔ وہ بندوں کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا نہ ان سے وہ کام لینا چاہتا ہے جس کی وہ قدرت نہیں رکھتے۔ کوئی شخص بھی رزق کھولنے اور بند کرنے کی قدرت وطاقت نہیں رکھتا بجز اس قدرت کے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مرحمت فرمائی ہے۔

وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ وہ اگر چاہتا تو مخلوق کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا تھا اس کی اگر مرضی نہ ہوتی تو کبھی بھی لوگ معصیت میں نہ بھٹکتے۔ بے شک اس پر قادر تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اگر ایسا کرتا تو پھر بندوں کی آزمائش نہ ہو سکتی"۔

معتزلہ کے عقیدہ عدل کے نتائج

معتزلہ ان اصول پر بندے کو اپنے افعال کا خالق قرار دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے خالق افعال کی نفی کرتے ہیں۔ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ عجز سے منزہ رکھا جائے خالق ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اس میں بندوں کو شریک کرنا شرک ہے لہذا اللہ تعالیٰ کو عجز سے منزہ کرتے ہوئے معتزلہ دوسری طرف شرک میں گرفتار ہو گئے۔

۲۔ وعدو وعید

معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ وعدو وعید لامحالہ وقوع پذیر ہونگے، اللہ تعالیٰ نے جو ثواب کا وعدہ کیا اور جو سزا کی دھمکی دی وہ پوری ہو کر رہے گی۔ اس نے جو مخلصانہ توبہ کی قبولیت کا وعدہ کیا ہے وہ بھی پورا ہوگا۔ نیک کام کرنے والا جزا پائے گا، اور بدکار سزا پائے گا۔

کبائر بلاتوبہ معاف نہیں ہوتے نہ نیکی کرنے والا جزا سے محروم رہتا ہے اس سے ان کا مقصد فرقہ مرجئہ کے عقائد کی تردید کرنا تھا جن کا نظریہ ہے کہ ایمان کی موجودگی میں معصیت سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا جس طرح کفر سے ہوتے ہوئے طاعت وعبادت کا کوئی فائدہ نہیں اگر فرقہ مرجئہ کی یہ بات صحیح ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی وعید بے اثر ہو جاتی

کفر واسلام میں درمیانہ درجہ

معتزلہ کے اس نظریئے کی توجیہ کرتے ہوئے شہرستانی لکھتے ہیں واصل بن عطاء کا قول تھا کہ ایمان عبارت ہے، فعال خیر سے جب یہ کسی شخص میں موجود ہوں تو وہ مومن ہے اور مومن ایک توصیفی نام ہے چونکہ فاسق میں خصال خیر کبھی جمع نہیں ہوتے۔ لہذا وہ توصیفی نام کا مستحق نہیں پس اسے مومن بھی نہیں کہا جائے گا۔ مگر اسے علی الاطلاق کافر بھی نہیں کہ سکتے۔ کیونکہ وہ کلمہ شہادت کا قائل ہے اور دوسرے اعمال خیر بھی اس میں

موجود ہیں ۔ جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن اگر وہ دنیا سے اس طرح رخصت ہو کہ کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو چکا ہو اور توبہ نہ کی تو وہ دوزخی ہے ۔ اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا کیونکہ آخرت میں صرف دو ہی فریق ہوں گے ایک فریق جنت میں ہو گا اور دوسرا جہنم میں ۔

البتہ اس کے ساتھ کچھ رعایت کی جائے گی کہ عذاب کچھ کم کر دیا جائے گا اور اسے کافروں سے ایک درجہ کم رکھا جائے گا ۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

معتزلہ کے نزدیک امر بالمعروف نہی عن المنکر تمام مومنوں پر واجب ہے ۔ تاکہ باطل کا مقابلہ کیا جائے اور حق کو پھیلایا جائے ۔ اب ہم معتزلہ کے مندرجہ بالا عقائد کے طرز استدلال کے بارے میں کچھ عرض کرتے ہیں ۔

عقائد میں معتزلہ کا طرز استدلال

عقائد میں معتزلہ نقلی دلائل و براھین کی بجائے عقلی دلائل و براھین پر زیادہ اعتماد کرتے تھے ۔ وہ اپنے مسائل کو عقل پر پیش کرتے پھر جسے عقل مانتی اسے قبول کر لیتے ورنہ اسے رد کر دیتے اس انداز فکر کے محرکات واسباب یہ تھے :

۱۔ یہ لوگ زیادہ عراق اور فارس میں بود و باش رکھتے تھے جہاں قدیم تہذیب و تمدن کی صدائیں گونج رہی تھیں ۔

۲۔ ان میں غیر عربی عنصر بہت زیادہ شریک تھا جن میں زیادہ تر موالی تھے ۔

۳۔ یہود و نصاری سے گھلے ملے رہتے تھے جنہوں نے فلسفیانہ افکار کو عربی زبان کا جامہ پہنایا تھا اس لئے وہ عقلی دلائل سے کام لینے کے عادی ہو گئے تھے ۔

عقل پرستی

آثار عقلی پر اعتماد و اعتقاد و یقین کا ہی یہ نتیجہ تھا کے معتزلہ اشیاء کے حسن و قبح کا فیصلہ ازروئے عقل کیا کرتے تھے ان کا کہنا تھا۔

"سب معارف (عقائدی مسائل) عقل سے سمجھے جا سکتے ہیں۔ اور واجب۔ ہے کہ عقل ہی سے ان میں غور کیا جائے۔ مثلاً وحی کے وارد ہونے سے پہلے ہی معلوم تھا کہ محسن کا شکر ادا کرنا ضروری ہے۔ حسن و قبح حسن اور قبیح کی، دو ذاتی صفات ہیں۔ مشہور معتزلی علامہ جبائی کا قول ہے۔

"ہر وہ معصیت جس کے متعلق عقل یہ سمجھتی ہو کہ اللہ تعالیٰ کو یہ امر کرنا چاہیے لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے انھیں منع کر دیا ہو تو وہ بھی اسی کی وجہ سے قبیح قرار پائے گا۔ نص پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ جب عقلیات کا غلبہ ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ بندہ گمراہ ہو جاتا ہے لہذا عقل کو کل دین تسلیم کرنا گمراہی ہے۔ اسلامی تعلیمات میں بالخصوص مسئلہ تقدیر عقلی اور فلسفیانہ موشگافیوں سے حل ہونے والا عقدہ نہیں ہے اس پر جتنا ہی احتیاط سے کام لیا جائے اسی قدر ایمان و عمل کے لئے بہتر ہے۔

معتزلہ کی افراط و تفریط اور بعض مسائل میں گمراہیوں کا تعاقب

تیسری صدی ہجری کے آخیر میں دو بزرگوں نے بڑا نام پایا جو معتزلہ کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور ان کے عقائد فاسدہ و باطلہ کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں یہ ہیں

۱۔ امام ابوالحسن اشعریؒ۔

۲۔ امام ابو منصور ماتریدیؒ۔

اب ہم ایجاز و اختصار کے ساتھ ان دو بزرگوں کے حالات لکھتے ہیں تاکہ قارئین ان کی خدمات سے آشنا و آگاہ ہو سکیں۔

امام ابوالحسن اشعریؒ

امام ابوالحسن اشعری ۲۶۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۳۳۰ھ کے لگ بھگ وفات پائی یعنی ستر ۷۰ سال کے قریب عمر پائی۔ آپ معتزلہ کے شیخ العصر ابو علی جبائی کے شاگرد تھے۔ کمال درجہ کی فصاحت و بلاغت کے مالک تھے شروع شروع میں معتزلہ عقائد کے حامی تھے لیکن تحقیق و ریسرچ کرنے کے بعد معتزلہ عقائد سے برأت کا اظہار کر دیا معتزلہ کے عقائد و نظریات کے رد کرنے کا کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا جمعۃ المبارک کے خطبہ میں برسرِ منبر معتزلہ عقائد سے برأت کا اعلان کیا اور ان کے عقائد و نظریات کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ امام ابوالحسن اشعریؒ اپنی تصنیف لطیف الابانتہ کے مقدمہ میں اپنے مسلک و منہج کی تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے معتزلہ پر مندرجہ ذیل اعتراضات وارد کئے ہیں۔

اما بعد۔ بہت سے معتزلہ و قدریہ اپنی خواہشات کی بناء پر اپنے پیش رو اکابر کی تقلید کرتے ہیں وہ قرآنی آیات کی تاویل منشائے شریعت کے خلاف کرتے ہیں ان کی یہ تاویل و تفسیر احادیث رسولؐ، ائمہ و سلف صالحین کے اقوال کے خلاف ہوتی ہے یہ رویت باری تعالیٰ کے منکر ہیں۔
حالانکہ رویت بالالبصار کے بارے میں صحابہ کرامؓ نے روایات نقل کی ہیں۔ معتزلہ ان روایات کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ رویات مختلف الجہات اور متواتر ہیں معتزلہ شفاعت نبویؐ کے بھی منکر ہیں اس کے علاوہ کفار کے عذاب قبر کے بھی منکر ہیں حالانکہ یہ اجماعی مسئلہ ہے جس پر سب صحابہ و تابعین متفق ہیں۔ معتزلہ کا عقیدہ خلق قرآن سے متعلق ان مشرکین عرب کے افکار سے میل کھاتا ہے جو قرآن مجید کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ:

اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ۔

یہ تو بس ایک انسان کا کلام ہے وہ یہ سمجھتے تھے کہ قرآن مجید انسانی کلام ہے جس طرح مجوس کے نزدیک خالق دو ہیں۔ ایک خالق صغیر اور دوسرا خالق شہیر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو ہوتا ہے

وہ اسے چاہتا نہیں ۔ بخلاف ازیں جمہور مسلمانوں کا اعتقاد یہ ہے کہ وہی چیز عالم وجود میں آتی ہے ۔ جس سے اللہ تعالی کی مشیت متعلق ہوتی ہے ۔ بدوں مشیت کوئی چیز منصۂ شہود پر جلوہ گر نہیں ہو سکتی ۔ وغیرہ وغیرہ

حضرت امام ابوالحسن اشعریؒ معتزلہ کے عقائد ونظریات کو نقل کر کے ان کی یوں تردید فرماتے ہیں ہم کتاب و سنت کی پیروی کرتے اور ان اقوال وآثار سے تمسک کرتے ہیں جو صحابہ تابعینؒ اور ائمہ حدیث سے منقول ہیں ہم امام احمد بن حنبلؒ کی ہموار کردہ راہ پر گامزن ہیں اللہ تعالی ان کی قبر پر لاکھوں رحمتیں نازل فرمائے آمین ۔ ہم امام احمد بن حنبلؒ کے مخالفین کے اقوال سے احتراز کرتے ہیں ، اس لئے کہ آپ ہی امام فاضل اور رئیس کامل تھے ۔ جب کفر وضلالت کا چرچا ہوا تو آپ کی بدولت اللہ تعالی نے حق کو واضح فرمایا ۔ مبتدعین کی بدعات کا استیصال کیا کج رو لوگوں کی کج روی دور کی جو لوگ شکوک وشبہات میں مبتلا تھے ان کے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا اللہ تعالی اس امام جلیل اور عالم نبیل پر رحم فرمائے اور سب ائمہ کرام پر باران رحمت برسائے آمین

امام ابوالحسن اشعریؒ کا یہ بیان اس حقیقت کا غماز ہے کہ آپ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے طرز فکر ونظر کو اپنا مذہب قرار دیتے ہیں اور انہی کے مقلد ہیں آپ فرماتے ہیں ہم اس کے کلام کو غیر مخلوق سمجھتے ہیں ۔ وہ جس چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے وہ کن کہنے سے عالم وجود میں آجاتی ہے دنیا کی ہر چیز صغیر ہو یا شہیر اس کی مشیت سے ظہور پذیر ہوتی ہے ۔ جملہ اشیاء کی یہی حالت ہے کوئی شخص اللہ تعالی سے پہلے کوئی کام نہیں کر سکتا ۔ نہ ہم اللہ تعالی سے بے نیاز ہیں اور نہ اس کے دائرہ علم سے باہر نکل سکتے ہیں ۔ اس کے سواء کوئی خالق نہیں بندوں کے اعمال اللہ تعالی کے پیدا کردہ اور مقرر کردہ ہیں ۔ قرآن مجید میں ہے ۔

واللہ خلقکم وما تعملون

اللہ تعالی نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا ۔ بندے کسی چیز کو پیدا

نہیں کر سکتے - بلکہ وہ خود مخلوق ہیں - ارشاد ربانی ہے

ام خلقوا من غیر شیء ام ھم الخالقون۔

ایسی آیات قرآن مجید میں بہت ہیں - اللہ تعالیٰ نے مومنین کو عبادت و ریاضت کی توفیق عطا فرمائی - یہ عین عنایت ربانی ہے - اگر وہ صالح بناتا ہے تو سب صالح ہو جاتے ہیں اور اگر ہدایت سے بہرہ ور کرتا ہے تو ہدایت یافتہ بن جاتے ہیں - ارشاد ربانی ہے -

وَمَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَھُوَ الْمُھْتَدِ۔

ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں - خیر ہو یا شر، تلخ ہو یا شیریں -

ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ و آشنا ہیں - کہ جو تکلیف ہمیں پہنچی وہ ملنے والی نہ تھی اور جو مصیبت رفع ہو گئی وہ ہم پر آنے والی نہ تھی -

۱- ہم قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور غیر مخلوق مانتے ہیں - ہماری نظر میں خلق قرآن مجید کا عقیدہ رکھنے والا کافر ہے -

۲- قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس طرح دیکھا جائے گا جیسے چودھویں کا چاند مومن اس زیارت سے مشرف ہوں گے - کفار اس زیارت سے محروم رہیں گے -

۳- ہم گناہوں کی بناء پر اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کرتے - مثلاً زناکاری، چوری، اور شراب نوشی وغیرہ کرنے سے کوئی کافر نہیں ہوتا البتہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص محرمات کی تحلیل کر کے ان کا مرتکب ہوتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے - یعنی جو شخص حرام کو حلال سمجھ کر کرے وہ کافر ہو جائے گا -

۴- شفاعت رسول برحق ہے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کے دن شفاعت کبریٰ پر فائز ہوں گے شفاعت سے بہت سے لوگوں کو دوزخ سے نکال کر جنت بھیجا جائے گا -

۵- ہم عذاب قبر پر ایمان رکھتے ہیں -

۶- ہمارے خیال میں اقوال و اعمال کے مجموعہ کا نام ایمان ہے اور وہ کم و

بحث ہوتا رہتا ہے ۔

۷۔ صحابہ کرامؓ واہلبیت عظام اور دیگر اکابرین وسلف صالحین کی محبت پر ایمان رکھتے ہیں ۔ خلفاء راشدین بالترتیب مسند خلافت پر فائز ہیں ۔ ان کی خلافت برحق ہے ۔

۸۔ ہم عشرہ مبشرہ کے جنتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں ۔ ہم جمیع صحابہ کرامؓ سے انس ومحبت رکھتے ہیں ۔ اور ان کے باہمی اختلافات کے بارے میں کسی رائے کا اظہار نہیں کرتے ۔

۹۔ ہم چاروں ائمہ دین کو رشد وہدایت کا مینارہ سمجھتے ہیں ۔

۱۰۔ ہم فتنہ وفساد کے زمانہ ترک قتال کو ترجیح دیتے ہیں ۔

۱۱۔ ہم خروج ،عذاب قبر اور منکر نکیر پر ایمان رکھتے ہیں ۔

۱۲ ہم معراج جسمانی کے قائل ہیں ۔

۱۳ ایصال ثواب کو جائز سمجھتے ہیں ۔

ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں [illegible] ۔

امام ابوالحسن اشعری اپنے عقائد ونظریات کو حضرت امام احمد بن حنبل سے ہم آہنگ قرار دیتے ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ میرے عقائد وہی ہیں جو امام احمد بن حنبلؒ کے تھے ۔

مسلک اشعریؒ میں اعتدال

امام ابوالحسن اشعریؒ کے عقائد ونظریات نفی واثبات میں مبالغہ کرنے والوں کے بین بین تھے ۔

معتزلہ ، قدریہ ، مرجیہ وغیرہ کی نسبت اعتدال سے زیادہ قریب تھے

حقیقتاً حضرت امام ابوالحسن اشعری ایک ایسے مسلک کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے جو ہر قسم کے اغراض وغلو سے پاک ہو ۔ آپ کی تصنیف لطیف "مقالات الاسلامیین" اسلامی فرقوں کے اقوال وعقائد کا نادر مجموعہ ہے ۔ آپ فرق مختلفہ کے اقوال وآثار کے دقیق النظر اور عمیق الذہن ناقل ہیں ۔

قرآن مجید، ذات و صفات باری تعالیٰ و دیگر تمام عقائد میں آپ کا
نقطہ نظر افراط و تفریط سے پاک ہے۔

مسئلہ تقدیر اور امام ابوالحسن اشعریؒ

قدرت خداوندی اور افعال العباد کے مسئلہ میں امام اشعری کا
مسلک جبریہ، قدریہ، معتزلہ کے نقطہ نظر کی نسبت زیادہ مبنی بر اعتدال ہے۔
جبریہ، قدریہ، معتزلہ کے عقائد کو آپ ملاحظہ کر چکے ہیں جو سب افراط و
تفریط پر مشتمل ہیں۔

امام ابوالحسن اشعری فرماتے ہیں۔ "بندہ احداث پر قادر نہیں البتہ
کسب کی استطاعت رکھتا ہے یہ عقیدہ قرآن مجید اور عقل سلیم کے عین مطابق
ہے جو غلو اور افراط و تفریط سے پاک ہے۔"

انسان خلق میں مجبور اور اکتساب میں مختار ہے یہ عقیدہ ایسا صاف
و شفاف ہے جس کو عقل تسلیم کرتی ہے۔

مسلک اشعری میں عقل و نقل کی ہم آہنگی

امام ابوالحسن اشعری نے عقائد پر استدلال کرتے ہوئے عقل و
نقل دونوں کا راستہ اختیار کیا ہے۔ کتاب و سنت میں اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرامؑ
کے جو اوصاف مذکور ہیں اس کے علاوہ روزِ آخرت، ملائکہ، ثواب و عقاب
وغیرہ ان کو دلائل عقلیہ اور براہین منطقیہ کی روشنی میں ثابت کرتے ہیں۔
ان کے نزدیک نقل و عقل دونوں کو اختیار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ کتاب و
سنت کی تصریح کی تصدیق کی جائے اور دلائل عقلیہ و منطقیہ سے ان کی
صداقت پر استشہاد کیا جائے تاکہ عقل مطمئن ہو جائے۔

امام ابوالحسن اشعری عقل کو حاکم قرار دے کر نصوص کی تاویل
نہیں کرتے بلکہ عقلِ انسانی کو بظاہر نصوص کا ایک ایسا خادم ٹھہراتے ہیں جو
ہر جگہ ان کی تائید و توثیق کرتا ہے۔ آپ عقل و نقل کی مطابقت و موافقت

ثابت کرنے کے لئے ان فلسفی و عقلی مسائل جو قضایا سے بھی مدد لیتے ہیں ۔ جن میں فلاسفہ و مناطقہ غور و خوض کرتے رہے ہیں ۔

عقلیت کی راہ اختیار کرنے کی وجہ

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام اشعری نے عقلیت کی راہ کیوں اختیار کی لہذا عقلیت کی راہ اختیار کرنے کی وجوہات حسب ذیل ہیں ۔

۱۔ امام ابوالحسن اشعری نے اعتقادی مسائل میں فلسفہ و منطق سے مدد اس لئے لی تاکہ معتزلہ کا رد کیا جا سکے کیونکہ معتزلہ کا طرز استدلال منطقیانہ و فلسفیانہ تھا اس کے علاوہ آپ معتزلہ کے شاگرد بھی تھے اسی وجہ سے بھی طرزِ استدلال نسبتِ تلمذ میں آپ کو ملا ۔ منطقیانہ و فلسفیانہ طرزِ استدلال کے بغیر معتزلہ کا رد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لہذا یہ ضروری تھا کہ انہیں کے انداز میں رد کیا جائے تاکہ قرآن و سنت کی اتھارٹی بھی قائم رہے اور عقائد باطلہ کا رد بھی ہو جائے یعنی سانپ بھی مر جائے اور عصا بھی محفوظ رہے ۔

۲۔ آپ فلاسفہ قرامطہ ، اور باطنیہ کے خلاف بھی نبرد آزما تھے ظاہر ہے ان کو خاموش کرانے کے لئے منطقی و فلسفی قیاسات سے بہتر کوئی چیز نہ تھی اور ان میں اکثر لوگ فلاسفہ و منطقی تھے جن کے لئے وجہ اطمینان عقلی دلائل ہی بن سکتے تھے لہذا اس وجہ سے یہ طرزِ استدلال کا طریقہ اختیار کیا گیا ۔ امام اشعری نے یہ طریقہ اختیار کرنے کے باوجود قرآن و سنت کی نصوص کو متاثر نہیں ہونے دیا ان کی حیثیت کو برقرار رکھ کر دشمن کا مقابلہ کیا ۔

امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات جلیلہ

آپ نے اس وقت اعتقادی مسائل کی صحیح صحیح تعبیر و تشریح کی جب اکثریت اہلِ علم افراط و تفریط اور گمراہیوں میں مبتلا و گرفتار تھی ۔ گویا کہ آپ کا وجود اہلِ علم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص رحمت تھا ۔

جس نے تمام مذاہب کے غلط و بے بنیاد عقائد و نظریات کی بیخ کنی کی افراط و تفریط سے محفوظ فرمایا۔

آپ کی علمی و تحقیقی خدمات کو جلد اہلِ علم نے قبول کرنا شروع کر دیا تھا اور بڑی قدر کی نگاہ سے لوگ دیکھنے لگ گئے تھے۔ آپ کے لاتعداد مقلدین مشرق و مغرب میں پھیلتے گئے۔ سرکاری حکام بھی آپ کی تائید و نصرت کا دم بھرتے تھے۔ اور کفار اور دیگر مذاہب کو بھی سزائیں دیتے تھے۔ آپ کے رفقاء اور مقلدین دوسرے بے بنیاد عقائد و نظریات پھیلانے والوں کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔ علماء عصر نے آپ کو امام اہلسنت و الجماعت کا لقب عطا فرمایا گویا کہ آپ کا مقام اعتقادی مسائل کے اماموں میں ایسا ہے جیسے فقہ میں امام اعظم ابو حنیفہ کا مقام ہے۔

امام ابوبکر باقلانیؒ متوفی ۴۰۳ھ
امام غزالیؒ متوفی ۵۰۵ھ و دیگر اکابر اشعری مسلک کے پیرو تھے ان بزرگوں نے تھوڑے بہت اختلاف (لفظی یا دلائل کے مقدمات) وغیرہ کی حد تک تو اختلاف کیا لیکن رہے مسلکاً اشعری۔ انہوں نے اشعری مسلک کو اطراف واکناف میں بہت متعارف کرایا۔ یہ اہلسنت والجماعت اشعری میں سرخیل مانے جاتے ہیں۔

۲۔ امام ابو منصور ماتریدیؒ

آپ سمرقند کے محلہ ماتریدیہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے سن ولادت میں اختلاف پایا جاتا ہے غالب گمان یہی ہے کہ آپ ۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۳۲ھ میں وفات پائی۔ آپ حنفی المسلک تھے۔ آپ زیادہ تر فقہ، اصولِ فقہ اور اصولِ دین کے علوم و معارف سے کامل طور پر واقف و آشنا تھے۔ آپ کا طرز استدلال بڑی حد تک اشاعرہ سے جداگانہ نوعیت کا تھا۔ آپ کے افکار و عقائد حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ سے ہم آہنگ ہیں آپ اصولِ فقہ کے علوم و معارف میں ید طولیٰ کا مقام رکھتے ہیں۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ اور ماتریدی افکار کی یگانگت

محققین کا کہنا ہے امام ابو منصور ماتریدی کے افکار و خیالات اور نظریہ و عقاید کی اصل و اساس امام اعظم ابو حنیفہؒ کے اصول پر تھی ۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے اپنی کتابوں میں جن جن مسائل پر بحث فرمائی ہے مثلاً :

۱۔ صفات باری تعالیٰ ۔

۲۔ کیا خدا کی معرفت حاصل کرنا عقل کی بناء پر واجب ہے یا شرع کی روشنی میں ۔

۳۔ کیا افعال میں ذاتی حسن و قبح پایا جاتا ہے یا نہیں ؟

۴۔ افعال العباد کو بندے کی قدرت کی طرف منسوب کرنا قدرتِ خداوندی کے منافی نہیں ۔

۵۔ تقدیر کا مسئلہ ۔

امام ابو منصور ماتریدی نے انہی مسائل کو عقلی و منطقی دلائل و براہین کی روشنی میں ثابت کیا کہ یہ مسائل قطعی طور پر شک و شبہ سے بالاتر ہیں

امام ابو منصور ماتریدی کا طرزِ فکر و نظر

ابو منصور ماتریدی اور ابو الحسن اشعری باہم معاصر تھے دونوں کے غایات و مقاصد میں چنداں فرق نہ تھا ۔ البتہ اشعری کی بود و باش مرکزِ مخالفین سے بہت قریب تھی محدثین و فقہا اور معتزلہ کے مابین زمینِ عراق میں جو معرکہ آرائیاں ہو رہی تھی بصرہ ان کا اہم ترین مرکز تھا جہاں تک ماتریدی کا تعلق ہے آپ ان معرکہ آرائیوں کی سرزمین سے دور بستے تھے ۔ تاہم ان مجالات و مناظرات کی صدائے بازگشت وہاں بھی سنائی دیتی تھی چنانچہ ماوراء النہر میں بھی معتزلہ آباد تھے عراقی معتزلہ ان کی کہی ہوئی باتوں کو دہراتے تھے ۔ ماتریدی نے انہی سے ٹکر لی اور ان کے نظریات کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ۔

اشعری اور ماتریدی دونوں ایک ہی دشمن کے خلاف صف آراء تھے ۔

لہذا ان دونوں کے نظریات بھی بڑی حد تک متقارب تھے اگرچہ متحد نہ تھے۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ اشاعرہ و ماتریدیہ کے نظریات میں کوئی اساسی و بنیادی اختلاف نہیں پایا جاتا علماء نے لکھا ہے:

"ماتریدیہ و اشاعرہ کا باہمی اختلاف دس مسائل سے متجاوز نہیں اور وہ بھی صرف نزاع لفظی کی حد تک ہے"۔

مگر امام ماتریدیؒ کے اقوال و آراء اور امام اشعری کے آخری آثار و نتائج کا دقیق مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ دونوں کا طرزِ فکر و نظر جداگانہ نوعیت کا ہے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ دونوں قرآن کے ثابت کردہ عقائد کو عقل و برھان کی روشنی میں ثابت کرنا چاہتے تھے۔ عقائدِ قرآن مجید کے دائرہ سے نکلنا دونوں کو گوارا نہ تھا البتہ ایک فریق پر نسبتاً عقلیت کا زیادہ غلبہ تھا۔ اشاعرہ اور ماتریدی کے عقائد و نظریات کے مابین اختلاف کا تفصیلی ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ہم اپنی کتاب حقیقتِ اختلاف اور ردِ انتشار میں تفصیلی ذکر کریں گے۔ یہاں پر اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ اشاعرہ کا مقام محدثین و فقہا اور معتزلہ کے بین بین ہے۔ جبکہ ماتریدیؒ کا مقام معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان ہے۔

امام ابو منصور ماتریدیؒ ان عقلی احکام سے استفادہ کرتے ہیں جو خلاف شرع نہ ہوں ان کے خلافِ شرع ہونے کی صورت میں ان کے نزدیک حکم شرع کے آگے گردن جھکانا ضروری ہے۔

مسئلہ تقدیر اور امام ابو منصور ماتریدیؒ

امام ابو منصور ماتریدیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی سب اشیاء کا خالق ہے۔ اس کائنات ارضی کی ہر چیز اس کی پیدا کردہ ہے۔ خلقِ اشیاء میں اللہ تعالی کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ خلق اشیاء کے فعل کو کسی اور کے لئے ثابت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی کا شریک ہے یہ بات نہ سمجھ میں آتی ہے اور نہ تسلیم کی جا سکتی ہے۔ حکمتِ خداوندی اس امر کی مقتضی ہے کہ بندہ صرف انہیں افعال میں جزاء کا استحقاق رکھتا ہے۔ جن میں وہ بااختیار

ہو۔ سزا کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیئے بلکہ سزا دینا جہاں حکمت کا مقتضاء ہے وہاں قرینِ عدل و انصاف بھی ہے۔

افعال العباد اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوت و طاقت سے انجام پذیر ہوتے ہیں۔ خلقِ افعال اور اکتساب افعال میں دونوں آپس میں متفق ہیں کہ خلق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور کسب کی نسبت بندوں کی طرف ہے جو کچھ پچھلے صفحات میں بیان کیا گیا ہے یہ ائمہ اربعہ اشاعرہ اور ماتریدی کے افکار و نظریات کا نچوڑ ہے۔ اور اسی میں حق ہے۔

دعوتِ مسلک اعتدال

اب ہم اس تناظر میں اتحاد امت کا فارمولہ پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ قارئین اس حقیقت سے آگاہ و آشنا ہو سکیں کہ امت کا اتحاد اختلاف رکھنے کے باوجود ہو سکتا ہے کیونکہ اتحاد امت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم امام ابوالحسن اشعریؒ اور امام ابو منصور ماتریدیؒ کے علم و عمل سے خیرات خلوص طلب کرتے ہوئے تمام مکاتب فکر کے معتدل بزرگوں سے گزارش کرتے ہیں کہ جس طرح ان بزرگوں نے فکری و نظری اعتقادی یلغار کے ماحول میں مسلکِ اعتدال کی دعوت دی اور مسلمانوں کو بد اعتقادیوں اور افراط و تفریط سے بچایا۔

آیئے آج کے دور میں کون ایسا کردار ادا کرنے کے لئے میدانِ عمل میں کودتا ہے۔

کون ہے جو وقت کی ضرورت کو پورا کرتا ہے؟

وہ کون ایسا مرد باصفا ہے کہ جس کو امام ابوالحسن اشعریؒ اور امام ابو منصور ماتریدیؒ کی روح کی مدد و معاونت نصیب ہوتی ہے۔

کیا ہم اس انتشار کو اختلاف کی حدود میں رکھتے ہوئے اختلاف کے آداب کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں؟

انتشار سے جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے اس کا نتیجہ بھی تمام مکاتبِ فکر کے علماء نے دیکھ لیا ہے کہ ہمارے انتشار سے کس کو فائدہ پہنچا اور کس کو نقصان پہنچا۔

پھر آیئے رجعت پسندی سے باز آئیں دشمنوں کے طعنوں کو ناکام بنا دیں کیونکہ :

دشمن عناصر تو ملاں کہہ کر دین کی عظمت کو داغدار کر رہے ہیں ۔
اور یہی انتشار ہمیں اس مقام پر لے آیا ہے کہ کوئی شخص مولوی سے متفق ہوتا نظر نہیں آرہا اب لوگ نفرت کر رہے ہیں کیا ہم نے کبھی اپنے رویے کو بدلنے کی کوشش کی ہے ؟

اگر نہیں اور حقیقتاً نہیں تو آیئے ہم سب ایک قرآن ، ایک اسلام ، ایک رسول ؐ کو ماننے والے ہیں لہذا سب سوچیں ۔

دیو بندی ، بریلوی ، شیعہ ، سنی ، اہلحدیث وغیرہ کے درمیان جو مسائل مابہ النزاع کا سبب بنے ہوئے ہیں ان مسائل پر درمیانی راہ نکالی جائے کیونکہ مقررین و خطباء نے ان مسائل کی حقیقت کو بیان نہیں کیا جس کی وجہ سے غلط غلط باتیں ایک دوسرے فریق پر منسوب کی جاتی ہیں حالانکہ ایسی باتوں سے وہ خود انکاری ہیں ۔ لہذا ہماری اہل علم حضرات سے گزارش ہے کہ وہ مسائل جو اصل عقیدہ کی بنیاد و اساس نہیں ہیں انہیں خواہ مخواہ عقائد کی اساس و بنیاد نہ بنایا جائے ۔ کیونکہ اس وجہ سے عوام بڑی پریشان ہو جاتی ہے ۔ ان اختلافی مسائل کو بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں ۔

میرے تمام مکاتبِ فکر کے اہلِ علم سے گزارش ہے جن کو وہ ٹھنڈے دل سے سوچیں اور غور و فکر کے بعد عوام الناس کو اس اعتقادی پریشانیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے میدانِ عمل میں اتریں ۔

۱۔ کیا توحید کو بیان کرنے کا یہی طریقہ رہ گیا ہے جس سے جملہ انبیاء کرام ؑ ، جملہ اولیاء و کاملین اور بالخصوص مقام نبوت ؐ کی تنقیص ہو ؟ کیا ہم توحید کو انہیں مخصوص مسائل میں محدود سمجھتے ہیں ؟ کیا ہم ذاتی و عطائی کا فرق ملحوظ رکھ کر توحید بیان نہیں کر سکتے ؟

اگر قرآن و سنت کی تصریحات کے مطابق ذاتی و عطائی کا فرق ملحوظ رکھ کر (جس کا ہم اقرار بھی کرتے ہیں) بیان کر سکتے ہیں تو پھر ہم توحید کو بیان کرنے کا اندازِ بیان کیوں نہیں بدلتے ؟

کیا ہم نے ایسی توحید کو ایمان کا مرکز و محور بنا رکھا ہے؟ جس سے تنقیص انبیاءؑ و اولیاء لازم آئے؟ کیا ہم ایسی توحید کے علمبردار ہیں جس سے امت مسلمہ کا اتحاد پارہ پارہ ہو؟

کیا ہم ایسی توحید کے پرچاری ہیں کہ جس سے پیٹ تو پلتا رہے لیکن امت کی وحدت پارہ پارہ ہوتی ہے تو ہوتی رہے؟ افسوس ہے ایسی توحید کے علمبرداروں پر جو جانتے اور سمجھنے کے باوجود دھڑا دھڑ تقاریر کرتے اور تصانیف لکھ رہے ہیں۔ کیا اسی کا نام دین کی خدمت ہے؟ جس سے منافرت پھیلے، اسلاف کے بارے میں بدگمانی پھیلے؟ اگر اسی کا نام توحید اور دین کی خدمت ہے تو خدارا دین اسلام کی حقانیت کو داغدار نہ کریں کیونکہ تمہارے رویے سے عوام بہت مظلوم ہو چکی ہے اگر تمہارا یہی رویہ رہا تو قیامت کے دن موجودہ حالات جو دین سے دوری کے ہو رہے ہیں اس کا خمیازہ آپ کو بھگتنا پڑے گا۔ نوجوان نسل ایسے ملاؤں کے کردار سے دین سے دور ہو رہی ہے۔ جو پیٹ کے لئے توحید کو استعمال کر رہے ہیں۔

۲۔ کیا مقام نبوت و رسالت کو بیان کرنے کا یہی طریقہ رہ گیا ہے؟ کہ مخصوص مسائل کو مقام نبوت کی اساس و بنیاد بنا دیں ہے۔ اور ان مسائل کو ایسا بیان کیا جائے کہ لوگ ذاتی، عطائی کا فرق سمجھنے سے بھی عاری ہو جائیں۔ اور غریب ان پڑھ عوام ان مسائل کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی بناء پر لوگوں سے شرک کے فتوی وصول کرتے رہیں۔ کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دیہاتی علاقوں میں واعظین و خطباء و مقررین ان مخصوص مسائل کو ایسا بیان کرتے ہیں جن کا اہلسنت کے عقائد سے دور کا واسطہ نہیں ہوتا۔

کیا ہم ان مخصوص مسائل کے بغیر مقام نبوتؐ کو بیان نہیں کر سکتے؟ کیا فضائل احادیث فقط انہی موضوعات پر ہیں؟ اگر ایسا نہیں اور ہرگز نہیں تو آیئے ہم آج سے اقرار کریں کہ ہم ایسی گفتگو کریں گے جس کی سب کو سمجھ آئے گی تاکہ اتحاد امت کی راہ ہموار ہو سکے۔

ہاں اگر کوئی سائل سوال کرتا ہے تو اسے احسن انداز یعنی بغیر کسی کیچڑ اچھالتے ہوئے جواب دیا جائے تاکہ سب کے لئے یکساں مفید ہو۔

اس سلسلے میں دونوں مکتب فکر کے اعتدال پسند بزرگوں سے گذارش ہے کہ
مہربانی فرما کر متنازع فیہ عبارات جو کتب میں موجود ہیں انہیں آئندہ ایڈیشن
میں نکال دیا جائے تاکہ

"نہ رہے سر نہ بجے بانسری"

کیونکہ انہی کی وجہ سے مناظرے و مجادلے ہوتے ہیں جس سے عوام میں سخت
کشیدگی ہو جاتی ہے اور دوسری طرف اپنے بزرگوں سے بھی گذارش ہے کہ
آج کے دور کے تقاضوں کے پیش نظر ان عبارات کے مصنفین پر جملے نہ
کسے جائیں تاکہ عوام کو ذہنی و اعتقادی پریشانیوں سے بچایا جا سکے۔

۲۔ کیا صحابہ کرامؓ کی محبت یہی ہے کہ آل رسولؐ سے بغض رکھا جائے؟ کیا
صحابہ کرامؓ کی اتباع و اطاعت کا یہی معنی ہے کہ یزید پلید کو صحیح کہا جائے؟
کیا حب صحابہؓ کرام کی دعوت یہی ہے جیسے ہم دے رہے ہیں؟ کیا جن
بزرگوں کی محبت کے ہم علمبردار ہیں وہ اپنے مخالفین سے یہی سلوک روا
رکھتے تھے جو ہم نے روا رکھا ہوا ہے؟ کیا منبر رسولؐ کی یہی شان ہے؟ کیا
اسی کا نام تبلیغ ہے کہ دوسرے پر کفر و شرک کی بوچھاڑ کی جائے؟ العیاذ باللہ
اگر ایسی ہے تو پھر اسے کوئی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ دین
رحمت ہے اور رحمت کا تقاضا یہ نہیں ہے جو ہم کر رہے ہیں۔

میں علی وجہ البصیرت کہہ رہا ہوں کہ صحابہ کرامؓ کی محبت کا نام
بغض آل رسولؐ نہیں بلکہ صحابہ کرامؓ کی محبت و غلامی کا نچوڑ تو غلامی محمدؐ و آل
محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ کیونکہ خود صحابہ کرام آل رسول کی محبت کو
اپنے آپ پر واجب قرار دیتے تھے۔ لہذا اس سلسلے میں میری گذارش ہے محمدؐ
و آل محمدؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں کی قصیدہ گوئی کا خاتمہ کیا جائے
اور جن جن کتابوں میں یزید کی قصیدہ گوئی کی گئی ہے ان عبارات کو حذف کر
دیا جائے یا پابندی لگا دی جائے۔ اس سلسلے میں کتب خانوں کے مالکان سے
رابطہ بھی کیا جا سکتا ہے اور علماء کا بورڈ بنایا جا سکتا ہے جو ان خرافات کا ڈٹ
کر مقابلہ کریں۔

۳۔ رسومات و بدعات کا مل جل کر خاتمہ کیا جائے جو دونوں مسلک کے نزدیک

درست نہیں ہیں اسے عوام غلط فہمی کی بناء پر دین یا دین کا جزو سمجھے ہوئے ہیں۔

۵۔ محمدؐ و آلِ محمدؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا دم بھرنے والوں سے بھی گذارش ہے کہ آلِ رسولؐ کی محبت کا معنی بغضِ صحابہؓ نہیں ہے۔ کیا ہم اس برادری کے معتدل بزرگوں سے سوال کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ جن جن مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے کیا ان کے بیان کرنے سے اتحاد کی راہ ہموار ہو سکتی ہے؟

کیا ہم ان مسائل کا ذکر کر کے دینِ اسلام پر احسان کر رہے ہیں؟ اور نہ ہی کیا جا سکتا ہے۔

اگر واقعتاً ایسا نہیں ہے تو پھر ہم اپنی تقاریر میں ایسا کیوں کرتے ہیں؟ کیا ان مسائل کے ذکر ہی میں آلِ رسولؐ کا مقام و مرتبہ پنہاں و پوشیدہ ہے؟ کیا ان مسائل میں ہی ذکر کیا جا سکتا ہے کیا ان مسائل کے علاوہ ذخیرہ مناقب نہیں ہے؟ اگر ہے تو پھر ہم اسے بیان کیوں نہیں کرتے؟

امید ہے کہ کیوں کا جواب سنجیدگی سے تلاش کیا جائے تو یہی ہو گا کہ مسئلہ ہمارے پیٹ کا ہے جس کو ہم پالنے کے لئے طرح طرح کے اختلافات بغیر کسی شرعی مقصد کے بیان کرتے رہتے ہیں۔

۶۔ رسومات، خرافات کے خاتمے کے نام پر جائز و مباح چیزوں کو ممنوع نہ قرار دیا جائے کیا بدعات و رسومات کا خاتمہ یہی ہے کہ تقلید کو بھی ممنوع قرار دیا جائے؟ کیا ائمہ اربعہ کی تقلید سے آزادی کا ہی نام ہے کہ لوگوں کو اسلاف سے بدگمان کیا جائے؟ العیاذ باللہ۔ اگر ایسا ہے تو یہ بتایئے دین جن جن ذرائع سے پہنچا ہے اگر وہ درست نہیں تو دین کیسے درست ہو گا؟

حقیقتاً ایسا نہیں ہے تو آیئے اعتدال پسندی کا دامن تھامیں تاکہ امت اس گردابِ انتشار سے محفوظ رہ سکے۔ موجودہ الیکشن میں ناکامی مذہبی قائدین کی انتشار پرستی کا نتیجہ ہے۔ ایک دوسرے کو مشرک، کافر، بدعتی، گمراہی کا فتویٰ لگانے کا نتیجہ ہے کہ قوم نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ قیادت اس لائق نہیں جو ایک دوسرے کو لڑاتے ہوں۔

شرک و کفر کی صدائیں بلند کرنے والے کبھی بھی اطمینان و سکون مہیا نہیں کر سکتے اور میں علی وجہ البصیرت کہہ رہا ہوں کہ عوام کا فیصلہ مذہبی قیادت کی عدم اتحاد کی وجہ سے درست ہے ۔ فقط انتخابی اتحادوں سے کبھی بھی انقلاب نہیں آسکتا اس کے لئے ضروری ہے عوام کو مطمئن کیا جائے ۔ اور اسلام کو بحیثیت مذہب نہیں بلکہ دین کے پیش کیا جائے اور جدید مسائل کی اسلامی تشخیص کی جائے تاکہ جدید ذہن کے شکوک و شبہات کا ازالہ ہو سکے ۔

اور دونوں نفوس برحق ہیں پس اسی نسبت کے لحاظ سے انہیں نبوت و رسالت سے فیض نصیب ہوا ہے ۔ باقی یہ بدعقیدگی و گمراہی ہوگی کہ آل رسول کی محبت کے دعوی پر صحابہ کرام کا بغض رواء رکھا جائے اور حب صحابہ کرام کی آڑ میں بغض اہلبیت کو رواء رکھا جائے یا حب معاویہؓ کے نام پر بغض علیؓ کی نشرو اشاعت کی جائے ۔ یہ دونوں زاویہ نگاہ ایمان و اسلام کے لئے کینسر ہیں ۔

لہذا ہم تمام مسلمانوں سے گذارش کرتے ہیں کہ آخرت میں جوابدہی کے پیش نظر اس افراط و تفریط سے اپنے ایمان کو محفوظ رکھیں ۔ اللہ تعالی ہم سب کو

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۔ "اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور فرقے نہ بنو ۔"

اس حکم قرآنی پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین ۔

-(سوال و جواب)

قارئین کے علمی و تحقیقی استفادہ کے لئے خطوط کے ذریعے پوچھے جانے سوالات کے جوابات جو مسئلہ تقدیر کے متعلق ہیں ان کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

دعوت بے اثر کیوں ہو جاتی ہے ؟

سوال محترم حسینی صاحب مہربانی فرما کر ہمارے اس سوال کا جواب جلد از جلد ارسال فرمائیں کیونکہ بڑا بے چین ہوں اور عجیب و غریب کیفیت میں دن گذر رہے ہیں لہذا پہلی فرصت میں جواب دیں۔

دعوت بے اثر کیوں ہو جاتی ہے ؟ حالانکہ یہی پیغام ہم پہلے دیا کرتے تھے تو لوگ کشاں کشاں دوڑے آتے تھے لیکن اب وہ صورتحال نہیں ہے اس کی آپ کے نزدیک کیا وجوہات ہیں ؟

جواب سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ انسانی کیفیات کا بدلنا کوئی عجوبہ نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی فطرت ہے۔

تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔

"کہ لوگوں کے حالات بدلتے رہتے ہیں"۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ

"ہر دن انسان کے لئے پہلے دن سے نیا ہونا انسانی فطرت کا تقاضا ہے"۔

جناب علی المرتضیٰ ؓ نے فرمایا:

کہ جس کے ارادے باندھیں جائیں اور ٹوٹتے رہیں اسے انسان کہتے ہیں اور جو یہ چاہے کہ ایک حالت پر قائم رہوں اور جو کچھ چاہوں وہی کچھ ہو جائے ایسی شان الوھیت ہے اور وہ اسی کے لائق ہے۔

آپ اس پر پریشان نہ ہوں کیونکہ کیفیت دل کا بدلتے رہنا ہی عروج و زوال ہے اپنی کیفیت کے بدلنے کا احساس ہو جانا انعام باری تعالیٰ ہے حضرت قبلہ سیدی و مرشدی قدس سرۃ العزیز کا عنایت فرمودہ وظیفہ کثرت سے پڑھیں نیکی کے اثرات دوام استمرار کی صورت میں جلوہ فگن رہیں گے ترقی درجات ہو گی۔

باقی دعوت کا با اثر ہونا یا بے اثر ہونا یہ سب داعی کے کمال عمل اور تضاد عمل کی وجہ سے ہوتا ہے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جب داعی کے قول وفعل میں مطابقت کمال درجے کی ہو تو دعوت کا اثر ایسے ہی ہوتا ہے جیسے آپ نے اپنے مشاہدات و تجربات کا ذکر کیا ہے۔

جب قول وفعل میں تضاد پایا جائے اور داعی کا کردار دعوت کی حقیقی گواہی نہ دیتا ہو تو دعوت بے اثر ہو جاتی ہے جیسا کہ آپ نے ذکر کیا ہے۔ اخلاص عمل کی روح ہے بغیر اخلاص کے عمل بیکار ہے۔

اس کے علاوہ مادہ پرستی اور دنیا طلبی دن بدن بڑھ رہی ہے اور دیندار گھرانے جن کے آباواجداد کی ساری زندگیاں وقف فی سبیل اللہ رہی ہیں ان کی اولادیں جاننے سمجھنے کے باوجود بھی بے عمل ہو رہی ہیں ان کو آپ علامات قیامت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں دنیا طلبی ہی تمام فسادات کی جڑ ہے یہ مال و دولت کا حرص بھی نیکی کو قبول کرنے میں رکاوٹ کا سبب بنتا ہے اس وجہ سے بھی داعی کے اخلاص کے باوجود دعوت کے ظاہری نتائج نہیں دکھائی دیتے۔

جس تصور اور حوالے سے آپ نے سوال کیا ہے وہ تفصیل طلب جواب کا متحمل ہے۔ یہاں پر اتنا عرض کر دیتا ہوں عاجز شروع سے ہی ظاہری نتائج اور کامیابی کے فلسفہ پر مطمئن نہیں تھا بلکہ اس وقت بھی یہی کہتا تھا کہ یہ فقط الفاظ وکلمات کے مفکرانہ پیچ و تاب ہیں حقیقت وہی ہے جس کا ذکر پہلے کیا جاتا رہا ہے۔

ہم خواہ مخواہ کے ان کو ناامیدی و بے یقینی اور فرسودہ ذہنیت سے تعبیر کرتے رہے ہیں بہر حال جو کچھ ہوا عملی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ محنت کرنا انسان کا کام ہوتا ہے اور اسے کامیابی دینا اور کامیابی سے نوازنا اللہ رب العزت کا کام ہے۔

اور اللہ رب العزت کسی کی محنت کو ضائع بھی نہیں فرماتا اور یہ بھی آپ کے مشاہدات میں ہے جو کچھ دینی جماعتوں کے ساتھ ہوا ہے یہ کوئی عقل کے خلاف نہیں ہوا ہے بلکہ وہی کچھ ہوا ہے جتنا ان کا خلوص تھا

اور یہ ہونا دینی جماعتوں کی عبرت کے لئے کافی ہے

کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم ایک دین ایک رسولؐ، ایک قرآن کے ماننے والے ایک ہونے کے باوجود متحد نہ ہو سکے اور اس کے برعکس برائی بڑی یا چھوٹی پھیلانے والے سب متفق ہو گئے۔

دینی جماعتوں کی ناکامی دین کی ناکامی ہرگز نہیں ہے نہ ہی اسے سمجھا جائے یہ سب مولویوں کے حیلے اور بہانے ہیں ہم بھی کافی عرصہ سے ان کا دین کے ساتھ درد سن رہے ہیں۔

اگر واقعی ان کو دین کا درد ہوتا تو پھر متحد ہو جاتے ان کا متحد نہ ہونا ہی ناکامی کی دلیل ہے

لہذا آپ مایوس نہ ہوں اجتماعی اصلاح کے لئے اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے انفرادی کوششوں سے اجتماعی اصلاح ناممکن ہوتی ہے۔

جنہوں نے خلوص کے ساتھ اتفاق و اتحاد کی ضرورت کو سمجھا اور اسے عملی طور پر ثابت کرنے کی کوشش کی ان کو ہم سب جانتے ہیں اور جو دین و قرآن کو اپنی چھوٹی کرسی کے لئے استعمال کرتے ہیں ان کے چہروں سے پوری قوم اچھی طرح واقف ہے۔ مخلصین کی انفرادی کوششیں بے اجر و ثواب نہیں ہوتیں انہیں ضرور اجر ملتا ہے

انقلاب پر پورا پورا یقین ہے اس گھڑی کی آمد کے لئے دعائیں بھی ہیں۔ جہاں تک دینی جماعتوں کی ناکامی اور انقلاب کے بارے میں تقدیری خدشہ ہے اس پر آپ خود بھی سوچیں۔ کہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو اقتدار یونہی مل جاتا ہے یا وہ نیک لوگوں کے مقابلے میں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے زیادہ قربانی دیتے ہیں تو یہ ایک حقیقت ہے کہ برائی پھیلانے والے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اپنا سب کچھ لٹاتے ہیں اور یہ سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔

کیا ہم اتنی محنت کرتے ہیں؟ اور قربانی دیتے ہیں جب ہم نہ اتنی محنت کرتے ہیں نہ اتنی قربانی دیتے ہیں جتنی درکار ہوتی ہے تو پھر ناکامی کو ہم کیسے تقدیر پر محمول کر سکتے ہیں؟

ہاں اگر قربانی اجتماعی دی جاتی اور پھر ناکامی ہوتی تو کہا جا سکتا تھا بغیر محنت اور قربانی کے ناکامی کو تقدیر کے کھاتے میں ڈالدینا دھوکہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔

یہ تو درست ہے کہ یہ سب کچھ خالق کے علم میں تھا لیکن ہمیں ایسے حالات سے نپٹنے کے لئے طاقت قوت عطا فرمائی ہے جسے استعمال کرنا ہمارا اختیار کام ہے۔

لہذا بغیر محنت اور قربانی کے ناکامی کو تقدیری فیصلوں پر محمول کرنا غلطی ہے مقاصد عظیمہ اور اس کے حصول میں کی جانی والی کوششوں پر آپ نظر دوڑائیں کیا ہم سرخرو ہونے کے اہل تھے بلکہ جو کچھ ہوتا رہا ہے یہ سب کچھ ہمارے اعمال کا نتیجہ باقی انقلاب پر پورا پورا یقین ہے لیکن یہ انقلاب کسی ایک مخصوص شخصیت کا محتاج بھی نہیں ہے اس کار خیر میں شریک ہونے کی کوشش اور دعا کرتے رہنا چاہیے کیونکہ اللہ رب العزت جس سے چاہے گا اس سے وہ کام لے لے گا۔ غلبہ حق کی بحالی کے لئے کوشش کرنا ہم سب پر فرض ہے۔ کسی مخصوص شخصیت کو ہی اس کا اہل سمجھنا اور باقی کو نااہل یہ غلط ہے۔ اہل و نااہل سب کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ جن کو لوگ اہل سمجھتے تھے اُن کی تدبیریں سب کے سامنے ہیں کہ وہ کیا کرنے والے ہیں اور کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ کسی ایک مخصوص شخصیت سے جذباتی عقیدت پر امید بنا لینے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان مایوس ہو جاتا ہے۔ شخصیت سے مایوسی، پھر اسلام سے یقین اٹھ جاتا ہے۔ لہذا شخصیت پرستی سے پرہیز کریں، اور فلسفہ نتیجہ خیزی، مادہ پرستانہ سوچ ہے۔ لہٰذا اس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں

تقدیر دعا کے منافی نہیں ہے

سوال محترم حسینی صاحب کافی دنوں سے عریضہ ارسال کیا تھا لیکن ابھی تک جواب نہیں ملا لہذا یہ عریضہ یاددہانی کے لئے ضبط تحریر کرکے ارسال کر رہا ہوں امید قوی ہے مایوس نہیں فرمائیں گے۔

میرا سوال یہ ہے:

۱: انسان کا مقدر پہلے سے طے ہو چکا ہے تو پھر دعا کے کیا معنی

ہیں ؟

جواب تقدیر کی دو قسمیں ہیں

۱۔ مبرم (حقیقی) اس کی تبدیلی ناممکن ہے

۲۔ معلق: عام دعاؤں اور نیک اعمال کے سبب سے بدل جاتی ہے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا

یمحو اللہ ما یشاء و یثبت عندہ ام الکتاب

اللہ جسے چاہے مٹاتا ہے اور ثابت کرتا ہے اور اصل لکھا ہوا اسی کے پاس ہے"

تقدیر مبرم کے لئے اگر خاصان بارگہ خداوندی اس کی تبدیلی چاہیں تو انہیں عرض کرنے سے پہلے ہی روک دیا جاتا ہے دعا اپنی جگہ درست ہے

تقدیر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رب العزت ایک بات طے کرنے کے بعد بے بس ہو گیا ہے وہ جس طرح فیصلہ کرتا ہے اسی طرح اس فیصلے کو بدلنے کا اختیار بھی رکھتا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے سے یہ طے کر چکا ہو کہ اگر یہ شخص دعا مانگے گا تو میں اپنے فیصلے کو بدل دونگا۔ اور اگر دعا نہیں کرے گا تو میں اس کے ساتھ طے شدہ فیصلے کے مطابق معاملہ کرونگا اسی کو اصطلاح میں تقدیر معلق کہتے ہیں

یعنی جس کے متعلق ردوبدل کی گنجائش رکھی ہو اسے تقدیر معلق اور جس کے متعلق گنجائش نہ رکھی ہو قطعی ہو نہ بدلنے والی ہو اسے تقدیر مبرم کہتے ہیں۔

لہذا آپ دعا کی اہمیت کسی طریقے پر کم نہ سمجھیں ویسے بھی اللہ رب العزت کی رحمت سے مایوسی وناامیدی کفر ہے اعمال حسنہ اور دعا کر کے امید رکھنی چاہئے اور یہی اب بندگی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کرم فرما دیتا ہے۔

کیا عمر کم یا بڑھ سکتی ہے ؟

محترم حسینی صاحب پچھلے دنوں ہمارے ہاں آپ کی تقریر تھی اور وہاں پر ایک سائل کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا انسان کی موت کا وقت

پہلے سے ہی متعین ہوتا ہے۔

تو اس پر میرا سوال یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر متنفس کا عرصہ حیات اللہ رب العزت کی طرف سے مقدر کر دیا گیا ہے اور اس میں کم و بیش نہیں ہو سکتا تو پھر بعض اوقات کسی مریض کے علاج میں کوتاہی اور غلط تشخیص مرض وغیرہ موت کا باعث بن جاتے ہیں تو ان حالات میں متوفی کا عرصہ حیات ہی اس قدر تھا یا اس کا علاج ہوتا تو وہ زندہ رہ سکتا تھا۔ لہذا مہربانی فرما کر اسکا جواب دیں

جواب جہاں تک تقدیر میں کئے گئے سوال کے جواب کا تعلق ہے تو اس کا خلاصہ یہ ہے۔

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (ال عمران ۳: ۱۴۴)

"کسی شخص کے لئے یہ نہیں کہ وہ اللہ تعالی کے حکم کے بغیر مر جائے۔ موت کا مقرر وقت لکھا ہوا ہے"۔

اسی آیت سے مفہوم اخذ کر کے عرض کیا تھا

"کہ موت کا ایک دن معین ہے"

اس سے مزید یہ کہنا کہ موت کا یک دن مقرر ہے اس لئے نہ تو انسان کی احتیاط اور تدابیر اس وقت معین کو موخر کر سکتی ہیں اور نہ ہی اس کی بے احتیاطی قبل از وقت موت لا سکتی ہے۔ اس نظریے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ لوگ عام طور پر اپنی صحت سے لاپرواہی برتتے ہیں بیمار ہونے پر علاج ہی نہیں کرتے اور اگر علاج کرتے بھی ہیں تو بڑی بددلی سے ناامیدی سے۔

اور جب بھی ان سے اس کے متعلق کہا جائے تو جواب میں یہی کہتے ہیں کہ موت اور بیماری سب پہلے سے لکھی ہوتی ہے۔

انسان کی کوئی تدبیر اس لکھے کو مٹا نہیں سکتی اگر موت آنی ہے تو ہزار تدبیروں کے باوجود آکر رہے گی اور اگر اسکا وقت نہیں آیا تو انسان جس قدر بے احتیاطی چاہے کر لے اسے کوئی مار نہیں سکتا۔

یہ قرآنی منشاء کے خلاف ہے

قرآن وحدیث کا منشا یہ ہے کہ ہر شخص جو پیدا ہوتا ہے اسے موت ضرور آئے گی لیکن اس نے کہیں یہ نہیں بتایا کہ موت کب آئے گی؟ اس لئے ہر شخص کی موت کا وقت وہ ہوتا ہے جب وہ مرجاتا ہے

اللہ رب العزت نے ہر چیز کے اثرات کے اندازے مقرر کر دیے ہیں مثلاً

۱۔ پانی کا ایک گلاس ہو تو وہ زندگی عطا کرے گا لیکن جب اسی پانی میں ڈوب جاؤ تو اسکے موت واقع ہو جائے گی

۲۔ آگ کے سامنے موسم سرما میں ہاتھ رکھو تو خوشگوار گرمی پہنچائے گی لیکن اس کے اندر ہاتھ ڈال دو تو ہاتھ جل جائے گا

۳۔ دوائی ڈاکٹر، حکیم کے مطابق مقدار کے ساتھ استعمال کی جائے تو صحت ہوگی اگر مکمل ڈبی یا نسخہ ایک وقت میں کھا لیا تو اس سے ہلاکت واقع ہو سکتی ہے۔

یہ اشیاء کے پیمانے ہیں جن کے اپنے اپنے اثرات ہیں پھر اسی طرح موت کے بھی پیمانے ہیں :

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ

"ہم نے تمہارے درمیان موت کے پیمانے مقرر کر دیئے یہ پیمانے ایسے قوانین کے مطابق متعین ہوئے ہیں جن میں تبدیلی نہیں ہوتی اسی چیز کو قرآن مجید میں کتاب موجل سے تعبیر کیا گیا ہے"۔

کتاب کے معنی قانون اور موجل کے معنی مقرر کردہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ قانون ہے کہ فلاں چیز سے ہلاکت ہوگی اور فلاں چیز سے زندگی یا صحت ملے گی۔

لَا تُلْقُوا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ

"اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو"

اگر مندرجہ بالا تصور کے مطابق موت کا وقت پہلے ہی سے مقرر ہوتا تو یہ کہنے کی ضرورت ہوتی؟

"کہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو"

لہذا تدبیر کرنا اور نکھے پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا قرآن مجید کے خلاف ہے کیونکہ اسی حکم سے خودکشی حرام قرار دی گئی ہے ۔ خودکشی کی صورتیں ہیں اور دونوں حرام ہیں

۱۔ آلہ قتل یا زہر سے اپنا خاتمہ چند لمحوں میں کر لینا

۲۔ آہستہ آہستہ خودکشی کرنا

مثلاً بیماری کی صورت میں کوئی علاج نہ کرنا

علاج نہ کرنا بھی گویا کہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈالنا ہے

قرآن مجید علم الطب کی کتاب تو نہیں کہ ۔۔ انسانی امراض اور ان کے علاج سے ہی بحث کرے لیکن اس نے ایسے ایسے اصول وقوانین دے ہیں جو علم الطب کی بنیاد و اساس ہیں ۔ کہ ایسے کاموں سے اجتناب کرنا چاہئے کہ جن سے امراض پیدا ہوتے ہیں اور ایسی چیزیں استعمال کرنی چاہئیں ۔ جن سے شفاء ملتی ہے

قرآن مجید نے ایک عام اصول دیا ہے

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا

"کھاؤ پیو، لیکن زیادتی نہ کرو"

یہ صحت کا بنیادی اصول ہے جس پر اطباء و حکماء حیران و ششدر ہیں اور شہد کے متعلق قرآن مجید نے وضاحت کی

وفیہ شفاءٌ للنّاس

"اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے"

یہ چیز روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی ہے اگر موت اور مرض کو ایک معینہ وقت پر آنا ہے جس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی تو پرہیز اور علاج سے متعلق ان ہدایات کی ضرورت ہی نہ تھی کمی و بیشی نہ ہوتی تو یہ ساری ہدایات عبث و فضول ٹھہریں گی

قرآن مجید کا منشاء یہ ہے کہ: "موت اور مرض کے لئے قانون مقرر ہیں"۔

یہ چیزیں ان ہی قوانین کے مطابق آتی ہیں اور ان ہی قوانین کے مطابق جاتی ہیں لہذا ایک خاص قانون کے مطابق عمر گھٹ جاتی ہے اور دوسرے قانون کے مطابق عمر بڑھ جاتی ہے

اسی کے متعلق اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ

"نہ کسی کی عمر بڑھتی ہے اور نہ گھٹتی ہے مگر قانون کے مطابق اس سے صاف ظاہر ہے کہ قانون کے مطابق عمر لمبی ہوتی ہے اور قانون کے مطابق کم ہوتی ہے"

اور قانون یہ ہے کہ بے احتیاطی سے عمر کم ہوتی ہے اور احتیاط سے عمر بڑھ جاتی ہے جسم کی مشینری خدائی مقرر کردہ قانون کے مطابق چلتی ہے اور انسان اپنے اختیار سے اس کی خلاف ورزی کر کے خراب کر سکتا ہے۔ اور صحیح استعمال سے عمر طبعی تک پہنچ جاتی ہے تو یہی کہا جائے گا۔ کہ موت کا وقت مقرر نہیں ہوتا بلکہ قانون مقرر ہوتا ہے۔ اسی تصور میں موت کا گھٹنا اور بڑھنا کہا جاتا ہے۔ باقی اللہ تعالےٰ کے علم میں سب کچھ ہے۔

کیا تقدیر تدبیر کے منافی ہے

سوال بعض لوگ وسیلہ پکڑنے سے منع کرتے ہیں کہ تدبیر کچھ نہیں سب کچھ تقدیر ہے اور بعض لوگ سب کچھ تدبیر کو سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں تقدیر کچھ بھی نہیں۔ ان کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب جس شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ تقدیر کچھ بھی نہیں ہے۔

۔ سب کچھ تدبیر ہے ایسا شخص غلطی پر ہے صریح نصوص کا انکار کرنے والا ہے۔ اسی طرح تقدیر کو کچھ نہ سمجھنا سب کچھ تدبیر کو سمجھنا بھی سخت غلطی ہے۔

صرف تقدیر پر ہاتھ پاؤں دھر کر بیٹھ جانا منشائے شریعت کے

خلاف ہے انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسباب کے موافق و مناسب ہاتھ پاؤں مارے اور اس کے بعد پھر یہ اعتقاد رکھے کہ میری تدبیر بھی اسی وقت کار آمد و مفید ہوگی کہ تقدیر موافق ہو۔ تقدیر اور تدبیر کا درمیانی راستہ اہل سنت کا عقیدہ ہے۔

کیا امیری یا غریبی منجانب اللہ پہلے سے طے ہوتی ہے؟

سوال محترم حسینی صاحب میرا ایک دوست کہتا ہے: "کہ ذریعہ معاش اختیار کرنا، اچھے یا برے کام کرنا دوزخ یا جنت کا ملنا، امیر یا غریب ہونا منجانب اللہ میری تقدیر میں پہلے ہی سے لکھے ہوئے ہیں۔ اور دوسرا دوست اس کے برعکس کہتا ہے۔ کہ یہ سب میرے کام ہیں۔ منجانب اللہ نہیں ہیں۔ تقدیر اندازہ یا عمل کے نتیجے کا نام ہے جو منجانب اللہ اٹل ہے۔ دونوں دوستوں کے مابین سخت کشیدگی ہو گئی ہے لہذا مہربانی فرما کر صحیح راستے کی نشاندہی فرمادیں تاکہ میں ان دونوں کو سمجھا سکوں۔

جواب آپ کے پہلے دوست (الطاف علی) کا یہ قول اس حد تک تو صحیح ہے کہ تمام کام جو انسانوں سے سرزد ہوتے ہیں۔ تقدیر ہی سے ہوتے ہیں۔ یعنی ازل سے ابد تک تمام حوادث و واقعات کا اللہ تعالیٰ کو علم اور اندازہ تھا اسی علم الٰہی اور قدر ایزدی کے موافق تمام حوادث و واقعات اپنے اپنے وقت پر ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی ایک ذرہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم مقدر سے باہر نہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو اچھے برے کاموں پر مجبور کر چکا ہے۔ یا کرتا ہے۔

مجبور اور اختیار کے فرق کو سمجھ کر مختار مانتا ہے تو درست ہے ورنہ غلط آپ کے دوسرے دوست کا یہ قول (میرا ہی فعل ہے منجاب اللہ نہیں) اُس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم اور قدر میں یہ باتیں نہ تھیں جو بندے نے کیں ہیں تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ اس سے جہل باری تعالیٰ لازم آتا ہے

بہر حال دونوں کی عبارات مبہم ہیں صاف صاف عبارت ہونی چاہیئے ۔ امیر و غریب ، جنتی اور دوزخی ہونے میں انسان مجبور و بے بس ہے تو غلط ہے ۔ اگر اپنے اختیاری اعمال کی بناء پر کوئی غریب و امیر جنتی اور دوزخی ہوتا ہے تو درست ہے ۔

امید ہے کہ آپ دونوں دوستوں کی اصلاح مکمل کتاب کا مطالعہ کر کے فرمائیں گے ۔ کیونکہ پوری کتاب کو پڑھنے کے بعد آپ بہتر سمجھا سکتے ہیں ۔

جہاں تک امیری اور غریبی کا تعلق ہے تو یہ انسان کی ذاتی محنت اور کاوش کا نتیجہ ہوتی ہے ۔

امیری اور غریبی میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور نہیں کیا ہے کہ وہ محنت و کوشش نہ کرے ۔ اگر ایسا ہوتا تو کئی لوگ ایسے ہیں جو غریبوں کے گھرانوں میں پیدا ہوئے لیکن محنت و مشقت کرنے پر امیر ہو گئے ۔ فقط امیر ہی نہیں ہوئے بلکہ بڑے بڑے رؤسا ان کے دست نگر ہو گئے اور اس طرح کئی لوگ امیروں' جاگیرداروں کے گھرانوں میں پیدا ہوئے لیکن اپنے اعمال و افعال بد کی بناء پر چند ٹکوں کے محتاج ہو گئے ۔ یہ مثالیں کئی دیکھنے میں آئی ہیں ۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر یہ تصور کر لینا کہ بھائی میرا لکھا رزق تو آ جائے گا اور مجھے کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا یہ تصور غلط ہے ۔ محنت کے بغیر امیری کی خواہش کا پورا نہ ہو سکنا یہ تقدیر کا اصول غلط ہے ۔ محنت و کوشش کرنے میں انسان مختار ہے مجبور ہرگز نہیں اور جو شخص محنت و کوشش کرے اس کا ثمر اسے ضرور ملتا ہے اللہ تعالیٰ ضائع نہیں فرماتا ۔ باقی جس بناء پر آپ کو امیری اور غریبی پر رونا آ رہا ہے وہ مسئلہ تقدیر کی بناء پر ہرگز نہیں ہے ۔ حقیقت حال یہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام صحیح طور پر پیش نہیں کیا گیا ۔ جس کی وجہ سے غریب طبقہ کا استحصال ہو رہا ہے ۔ اس صورت حال میں بعض لوگ محنت و مشقت کرنے کے باوجود دن بدن غریب ہو رہے ہیں ۔ لہٰذا یہاں پر اتنی گنجائش نہیں ہے کہ آپ کو اسلام کا معاشی نظام تفصیلاً بتاؤں ۔ یہ ایک فکری و علمی اور وقت کی اہم ترین ضرورت ہے ۔ اس کو ہم اپنی کتاب "اسلام کا معاشی نظام" میں تفصیلاً "گفتگو کریں گے ۔ یہاں پر چند بنیادی باتیں عرض کئے دیتا ہوں تاکہ وقتی شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جائے ۔ موجودہ دور کی غریبی اور امیری پاکستان کے فرسودہ نظام کی وجہ سے ہے جس کی وجہ سے غریب غریب سے غریب تر ہو رہا ہے اور امیر امیر

سے امیر تر ہو رہا ہے۔ انسان کی معاشی زندگی کو عدل و انصاف اور صداقت و عدالت پر قائم رکھنے کے لئے اسلام نے چند بنیادی اصول و قوانین اور حدود مقرر کر دی ہیں۔ تاکہ سرمایہ و دولت کی پیدائش، مصرف اور استعمال اور گردش کا سارا کا سارا نظام انہی خطوط و حدود کے اندر اندر چلے۔ جو اس کے لئے اسلام نے مقرر کر دیئے ہیں۔

ا۔ قرآن و سنت کی رو سے اللہ تعالیٰ نے زمین اور اس کی جملہ تمام چیزیں انسان کے لئے بنائیں ہیں تاکہ انسان ان سے نفع و فائدہ اٹھائے۔ اس لئے ہر انسان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ زمین سے رزق کے حصول کے لئے تگ و دو اور کوشش و محنت کرے۔ اس پیدائشی اور بنیادی حق میں سب انسان برابر ہیں۔ کوئی شخص کسی کو اس سے محروم نہیں کر سکتا۔ رزق کے وسائل میں کوئی کسی کو روک نہیں سکتا۔ کہ وہ یہ کام کرے اور دوسرے پر اس کا دروازہ بند ہے۔

اسلام وسائل معاش و معیشت کو کسی خاندان کے قبضے میں دینے کی اجازت نہیں دیتا۔ کہ وہ ان وسائل پر قابض ہو جائے اور اپنی مرضی سے ان کی تقسیم کرے۔ اس کی اسلام کسی کو بھی اجازت نہیں دیتا۔ یہ سب انسانوں کا یکساں حق ہے اور اس کی کوشش کے لئے سب کو مواقع میسر ہوں کسی تفریق کے بغیر یہ کوشش انسان کا بنیادی حق ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی جن نعمتوں کو تیار کرنے یا انہیں کار آمد بنانے میں کسی کی محنت اور کوشش کا کوئی عمل دخل نہ ہو تو وہ سب انسانوں کے لئے یکساں بغیر کسی تفریق کے جائز و مباح ہیں۔ ہر شخص کو اپنی اپنی ضرورت کے مطابق ان سے فائدہ و نفع اٹھانے کی اجازت ہے۔ جیسے "دریاؤں اور چشموں کا پانی، قدرتی درختوں کے پھل، جنگل کی لکڑی، خود رو اور جڑی بوٹیاں، گھاس، سطح زمین پر کھلی ہوئی کانیں" ان چیزوں پر کسی ایک خاندان یا فرد کی اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔ اور کسی شخص کو ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے منع نہیں کیا جا سکتا۔ ایک صورت یہ ہے کہ جو لوگ تجارتی اغراض کے لئے وسیع پیمانے پر ان میں سے کسی کو استعمال کرنا چاہئیں ان پر حکومت ٹیکس لگا سکتی ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں انسانوں کے نفع و فائدہ کے لئے پیدا کی ہیں۔ انہیں بے کار فالتو رکھنا صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کا واضح اصول و قانون ہے۔ یا تو خود فائدہ اٹھاؤ

ورنہ دوسروں کے لئے چھوڑ دو' تاکہ دوسرے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس اصول کے پیش نظر اسلامی قانون یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کوئی شخص حکومت کی عطا کردہ زمین کو تین سال سے زیادہ مدت تک بنجر خالی یعنی افتادہ حالت میں نہیں رکھ سکتا۔ اگر تین سال کے عرصہ تک اس کو زراعت یا عمارت یا کسی دوسرے کام میں استعمال نہیں کرتا تو یہ زمین متروکہ سمجھی جائے گی۔ کوئی دوسرا شخص اسے اپنے استعمال میں لے آئے تو اس پر دعویٰ نہیں کیا جاسکے گا اور اسلامی حکومت کو بھی یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ یہ زمین لے کر دوسرے ضرورت مندوں کو دے جو اس کو استعمال کر کے اپنی ضروریات پوری کریں۔

۴۔ جو شخص براہ راست اللہ تعالیٰ کی قدرت کے خزانوں میں سے کوئی چیز لے اور اسے اپنی کوشش و محنت اور قابلیت و صلاحیت سے اس کو کار آمد بنائے وہ اس چیز کا مالک ہے۔ اسلامی نظریے کے مطابق دنیا میں تمام مالکانہ حقوق کی ابتداء اسی طرح ہوئی ہے۔ جس مباح چیز کو جس نے کار آمد بنایا وہ اس کا مالک ہے اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسے اپنے استعمال میں رکھے اور دوسرے اسے استعمال کرنا چاہیں تو ان میں سے اس کا معاوضہ لے۔ یہ تصور انسان کے سارے معاشی معاملات کی فطری بنیاد ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ

یہاں پر معاشی نظام کے سلسلے میں رزق میں مساوات کا تصور بھی پیش کیا جاتا ہے۔ جو منشائے شریعت کے خلاف ہے۔ اس عدم مساوات سے بھی امیری اور غریبی کو منجانب اللہ یعنی مجبوری سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا یاد رہنا چاہیے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرح طرح کی نعمتوں کو تقسیم کرنے کے لئے مساوات کو ملحوظ نہیں رکھا۔ بلکہ نظام ربوبیت کی اپنی حکمتیں ہیں۔ جس کی بناء پر بعض انسانوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ خوب صورتی' خوش اخلاقی' تندرستی' جسمانی و دماغی طاقت و قوت اور پیدائشی ماحول سب کو یکساں میسر نہیں ہے۔ ایسا ہی معاملہ رزق کا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بنائی فطرت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ انسانوں کے درمیان رزق میں تفاوت ہو۔ اسلام جس مساوات کا قائل ہے وہ رزق میں مساوات نہیں بلکہ وہ حصول رزق کی جدوجہد کے مواقع میں ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے میں ایسی قانونی رواجی رکاوٹیں

حائل نہ ہوں جن کی بناء پر کوئی شخص اپنی قابلیت و صلاحیت اور طاقت و قوت کے مطابق معاشی تگ و دو نہ کر سکے۔ اور ایسے امتیازات باقی نہ رہیں، جو بعض طبقوں، خاندانوں، کی پیدائشی خوش نصیبی و خوش بختی کو مستقل قانونی تحفظات میں تبدیل کر دیتے ہوں۔ یہ دونوں طریقے بنیادی طور پر فطرت نامساوات کی جگہ زبردستی ایک مصنوعی نامساوات قائم کرتے ہیں۔ جس کو جو ماحول پیدائشی طور پر ملا ہے وہ اسی پر رہ کر معاشی جدوجہد میں شریک ہو۔ جس کو پیدائشی ماحول میں کار ملی ہے وہ اس پر سوار ہو کر کوشش کرے اور جس کو پیدائشی ماحول میں سائیکل ملا ہے وہ اس پر سوار ہو کر جدوجہد اور تگ و دو کرے۔ معاشی جدوجہد میں اسلام مساوات کا قائل ہے۔ سائیکل والا محنت کر کے موٹر لے سکتا ہے۔ اور موٹر کار والا اپنی نااہلی سے غریب ہو جائے تو وہ پیدل مارچ کرے۔ کوشش و جدوجہد میں کسی کو روکا نہیں جا سکتا۔

۵۔ اسلام لوگوں کے دلوں میں رحم پیدا کرتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے سکون و اطمینان کا سبب بنیں۔ اسلام معاشرے میں معذور، بے وسیلہ، اپاہج لوگوں کی خدمت کے لئے مستقل ادارہ کو ناگزیر قرار دیتا ہے۔ جو ان کی خدمت میں کاربند رہے۔ اس ادارہ کا کام ہے جو لوگ بعض مجبوریوں کی بناء پر معاشی جدوجہد میں گر پڑیں۔ ادارہ انہیں اٹھائے اور ان کو پھر سے معاشی جدوجہد میں شریک کرے۔ یعنی اتفاقات کی صورت میں مدد و اعانت کرے۔ اسلام نے اس سلسلے میں عشر و زکوٰۃ کا نصاب مقرر کیا ہے تاکہ یہ [illegible] لوگوں کے کام میں آئے جس سے غربت کا خاتمہ ہو۔ یہ ایک ایسا اجتماعی انشورنس ہے جس کی موجودگی میں کوئی شخص معاشرے میں بنیادی ناگزیر ضروریات زندگی سے کبھی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔ اس وجہ سے صدقات و خیرات کی تعلیم دی گئی ہے۔ جس کی قرآن و سنت میں بہت بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اسلامی نظام کی صورت میں کوئی شخص فاقوں کی نوبت میں نہیں آتا۔ حضرت عمر فاروقؓ کا مشہور قول ہے:

"اگر دریا دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے دن مجھ عمرؓ سے حساب ہو گا۔"

کیا ہمارے حکمران اس خدا خوفی سے آراستہ و منور ہیں؟

ان کو اسلام سے محبت ہے؟

میرے بھائی

لقمہ حلال کے لئے ترسنا اور بنیادی ضروریات زندگی کا میسر نہ آنا۔ ان کو ہم منجانب اللہ غریبی پر محمول نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم سب غلبہ اسلام کے لئے کوشش کریں تاکہ سب کو اسلام کی برکات نصیب ہوں۔۔ جس سے ایسے خدشات کا خاتمہ ہو سکے۔ اس کے لئے آپ کو مخلص قیادت کی رہنمائی اور سرپرستی میں اپنی صلاحیتیں وقف کرنا ہوں گی باقی آپ ہمارے مشن اور تحریک سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے۔

کیا صدقات و خیرات تقدیر کے منافی ہیں ؟

سوال : کیا صدقات و خیرات سے بیماری رفع ہو سکتی ہے ؟ اور موت ٹل سکتی ہے یا نہیں ؟

جواب : صدقات و خیرات کی قرآن و حدیث میں بہت اہمیت بیان کی گئی ہے ۔ جس سے انکار ممکن نہیں ہے ۔ صدقہ و خیرات کی برکت سے بیماری کا رفع ہو جانا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

صدقہ آفات و بلیات کو ٹال دیتا ہے

بیماری کا رفع ہونا صحت کی علامت ہے اور صحت و تندرستی عمر کا تقاضا کرتی ہے بہرحال صدقہ و خیرات کرتے رہنا چاہیئے ۔ اس سے ظاہری و باطنی امراض کا خاتمہ ہوتا ہے ۔ صدقہ و خیرات کی اہمیت کو کسی طرح کم نہیں کیا جا سکتا۔

کیا پرندوں کو فصل سے روکنا تقدیر کے منافی ہے ؟

سوال : محترم حسینی صاحب میرے ایک دوست کی دھان کی فصل ہے جو پک چکی ہے پرندوں کے جھرمٹ صبح و شام فصل پر اڈے چلے آتے ہیں اور انہوں نے فصل کی حفاظت کے لئے نوکر رکھا ہوا ہے اور دوسرا دوست یہ کہہ کر منع کرتا ہے کہ ہر دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے لہذا شرعی اعتبار سے پرندوں کو نہیں روکنا چاہیئے ۔ کیا یہ فی الواقع درست ہے ؟

جواب : شریعت اس بات سے ہرگز نہیں روکتی کہ آپ اپنی کوشش کی حد تک کھیتی کو

پرندوں کے نقصان سے بچانے کے لئے نوکر ضرور رکھیں نوکر رکھنے کے باوجود اگر پرندے فصل کھائیں تو آپ کی طرف سے صدقہ ہے۔ پرندوں کے ساتھ بے دردی یعنی ہر وقت غلیل تھامے ان کی جان کے درپے رہنا درست نہیں ہے۔ اس دنیا میں اللہ جل شانہ کی جتنی مخلوق ہے وہ مفت میں نہیں کھا رہی بلکہ اس کے عوض کوئی نہ کوئی خدمت سرانجام دے رہی ہے۔ یہ پرندے کھیت کو تباہ کرنے والے نہ جانے کتنے کیڑوں کا صفایا کر دیتے ہیں۔ پرندے کیڑے مار دوائیوں سے کہیں زیادہ فوائد پہنچاتے ہیں۔

چین نے چڑیوں کو ملک سے ختم کرنے کا خمیازہ یہ بھگتا کہ کھیتی کی کھیتی ان کیڑوں کی نذر ہو گئی یعنی جتنا نقصان چڑیوں نے کیا اس سے کہیں زیادہ نقصان کیڑوں نے کر دیا تب کہیں ان پر منکشف ہوا کہ پرندوں کی کیا مصلحت ہے کوشش نہ کرنا توکل کے خلاف ہے۔

نوکر رکھیں لیکن حد سے زیادہ سختی بھی بہتر نہیں ہے۔

کیا پسند کی شادی نہ کرسکنا تقدیر الٰہی سے ہے؟

سوال: محترم حسینی صاحب میرے گھر والوں نے میری پسند کے بغیر میری شادی کر دی ہے جو مجھے راس بھی نہیں آئی بلکہ میں اس کے کردار سے بھی مطمئن نہیں ہوں تو جب میں گھر والوں سے شکوہ و شکایت کرتا ہوں تو میرے والدین مجھے یہ کہہ کر خاموش کرا دیتے ہیں کہ "تیری قسمت یہاں تھی" کیا والدین کا ایسا رویہ روا رکھنا شرعی اعتبار سے درست ہے؟

جواب: اگر آپ کے والدین کے نزدیک تقدیر کا معنی مجبوری ہے تو یہ تصور صریح نصوص کے مخالف ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ (نساء: ۴:۳)

"جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو"

آیۃ کریمہ سے صاف انسانی اختیار کا اظہار ہو رہا ہے۔ لہٰذا آپ کو اس سلسلے میں ازدواجی زندگی کے انتخاب کی شرعی حیثیت کا خلاصہ عرض کر دیتا ہوں جس سے آپ بخوبی سمجھ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو رشتہ ازدواج میں ہرگز ہرگز مجبور نہیں

کیا نہ ہی اس مغالطے میں رہنا چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کی ترغیب دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سلسلے میں تفصیلی ہدایات دے کر ہر ہر موڑ پر رہنمائی بھی فرمائی۔ نکاح کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بیوی کے انتخاب کا معیار کیا ہو؟ اس بارے میں وہ معیار سامنے رکھنے کی تعلیم دی ہے جس سے نکاح کے فوائد اور مقاصد کے حصول میں مدد ملتی ہے اور زوجین کی زندگی خوشگوار تر بن جاتی ہے میاں بیوی ایک دوسرے کے حقیقی رفیق اور خیر خواہ بن جاتے ہیں۔

میاں بیوی کے ازدواجی تعلق میں ان مقاصد کا حاصل ہونا نہ ہونا زیادہ تر عورت کے مزاج اور اس کے اوصاف پر موقوف ہوتا ہے اگر بیوی ان خوبیوں اور اوصاف سے آراستہ ہو جو خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہیں تو میاں بیوی کی زندگی خوشگوار، قابل رشک اور ان دونوں کی دنیا جنت کا نمونہ بن جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اچھی عورت کو دنیا کی بہترین نعمت قرار دیا ہے۔

ما استفاد المومن بعد تقوي الله خير الہ من زوجة صالحة ان امرها اطاعته وان نظر اليها سرته وان اقسم عليها برته وان غاب عنها نصحته في نفسها وماله (رواه ابن ماجه)

مومن کو تقوی کے بعد سب سے زیادہ اچھی بیوی سے فائدہ پہنچتا ہے (اور اچھی بیوی کے اوصاف یہ ہیں) جو شوہر کی فوراً تعمیل کرتی ہو، شوہر کو اس کی طرف دیکھ کر خوشی حاصل ہوتی ہو اس پر اعتماد کرتے ہوئے قسم کھالے تو وہ اسے پورا کر دیتی ہو شوہر کی عدم موجودگی میں اس کے مال کو ضائع نہ کرتی ہو اور بیوی اپنی خدمت سے بھی اسے کسی طرح کا رنج نہ پہنچنے دیتی ہو۔

ہمارا نوجوان طبقہ عام طور پر جذبات سے مغلوبیت کی بناء پر حسین صورت کو حسین سیرت پر ترجیح دیتا ہے تمام اوصاف سے زیادہ خوبصورتی کی خواہش رکھنا کوتاہ اندیشی کے سوا کچھ بھی نہیں خوبصورتی جلد متغیر ہو جانے والا وصف ہے اور اس کا عام طور پر مشاہدہ کیا گیا ہے فقط خوبصورتی کی خواہش پر کئے جانے والے رشتے دوسرے تیسرے بچے کی پیدائش پر چاہتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

تنکح المراۃ لاربع لمالھا ولحسبھا وجمالھا فاظفر بذات الدین (رواہ البخاری)

"عورت سے نکاح کرنے کی رغبت (عموماً) چار چیزوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ۱۔ دولت ۔ ۲ ۔ خاندانی وجاہت ۔ ۳۔ خوبصورتی ۔ ۴۔ اور دینداری"

تم دیندار عورت سے نکاح کرنے میں کامیاب ہو جاؤ یعنی دیندار عورت سے نکاح کرو یہی بڑی کامیابی ہے ۔

قابلِ ترجیح وصف دینداری ہے جس شخص کو دیندار بیوی مل جائے وہ خوش نصیب اور کامیاب ہے کیونکہ حقیقی دینداری عورت کو تمام حقوق ادا کرنے ، برائیوں سے بچنے اور ہر قسم کی خیر خواہی پر آمادہ کرے گی جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ شوہر کی اطاعت ، اپنی عصمت کی حفاظت ، مال و متاع کی نگرانی ، خرچ میں کفایت شعاری ، اولاد کی تربیت اور شوہر کی خیر خواہی وغیرہ تمام کام بااحسن اسلوب انجام دے گی ۔

جس طرح بیوی کے انتخاب میں دینداری کو ترجیحی وصف قرار دیا گیا ہے اسی طرح شوہر کا بھی یہی وصف لائق ترجیح ہو گا کیونکہ دینداری شوہر کو بیوی کے حقوق ادا کرنے پر جس درجہ پر آمادہ کر سکتی ہے دوسری کوئی چیز نہیں کر سکتی ۔ دیندار آدمی عورت کو پسند کرے تو تب قدر اور پیار کرے گا ، اگر ناپسند کرے تو وہ ظلم نہیں کرتا ۔ میاں بیوی دونوں کی طبیعتوں میں فرق اور مزاجوں میں مناسبت کا ہونا ضروری ہے فقہائے کرام نے فقہ کی کتابوں میں انہی حکمتوں اور مصلحتوں کی بناء پر کفو کا باب شرعی عنوان کے طور پر رقم کیا ہے ۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے کوئی بھی ہوشمند انسان انکار نہیں کر سکتا کہ ماحول اور طرزِ معاشرت کے اختلاف سے مزاجوں اور عادتوں میں عموماً اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جس کا تفصیلی ذکر نہیں کیا جا سکتا ۔ ہمارے ہاں لڑکے اور لڑکی کے والدین افراط و تفریط سے کام لیتے ہیں ایک طبقہ والدین کا ایسا ہے جو لڑکے اور لڑکی کو بتانا توہین سمجھتے ہیں اور ناواقفیت کی بناء پر شریعت کے بھی خلاف سمجھتا ہے جو حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔

دوسرا طبقہ والدین کا ایسا ہے جو مغربی تقلید میں اتنا آگے ہے کہ لڑکے اور لڑکی کو مکمل آزاد کر دیتے ہیں ۔ اس سلسلے میں شریعت نے راہ اعتدال کا درس دیا ہے

جس کو اپنانے سے عائلی پریشانیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور آپ کی پریشانی بھی یہی ہے۔ تقدیر کو خواہ مخواہ نہیں کوسنا چاہیئے۔ کیونکہ انسان کو اختیار دیا گیا ہے اور اختیار کے باوجود تقدیر کے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا کوئی قرینہ انصاف نہیں ہے۔

شریعت نے مخطوبہ (منگیتر) کو دیکھنے کی اجازت دی ہے کہ نکاح سے پہلے دونوں ایک دوسرے سے ضروری واقفیت حاصل کر لیں تاکہ ہر اقدام سوچ سمجھ کر ہو غور وفکر کے بعد ہو اور کسی کو بعد میں پچھتانا نہ پڑے اسی غرض سے دیکھنے کی اجازت دی گئی ہے حالانکہ اجنبی مرد اور عورت ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے لیکن جس سے رشتہ طے ہونے والا ہو اس کو دونوں دیکھ سکتے ہیں۔ آنحضرت نے فرمایا:

اذا خطب احدکم المراۃ فان استطاع ان ینظر الی مایدعوہ الی نکاحھا فلیفعل (رواہ ابوداؤد)

"جب تم عورت کو نکاح کا پیغام دو (یا دینا چاہو) تو اگر یہ ممکن ہو کہ اس کے وہ اوصاف دیکھ سکو جو نکاح میں مطلوب ہیں تو ضرور ایسا کر لو"۔

محدثین کے نزدیک دیکھنے اور پسند کرنے کا عمل پیغام دینے سے پہلے ہونا چاہیئے۔ اس طرح ہونے سے لڑکی اور اس کے سرپرستوں کو پتہ نہیں چلتا کیونکہ ناپسندیدگی کی صورت میں لڑکی اور اس کے اولیاء (سرپرستوں) کی بدنامی نہیں ہوتی۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

لم یشترط استیذانھا ولانھا تستحی غالیا من الاذن ولان فی ذالک وتعزیرا فربما راٴتھا فلم تعجبہ فیترکھا فتنکر وتفاذی بہ ولھذا قال اصحابنا یستجب ان یکون نظرہ الیھا قبل الخطبۃ حتی ان کرھھا ترکھا من غیر ایذاء بخلاف ما اذا ترکھا بعد الخطبۃ (صحیح مسلم شرح نووی)

"دیکھ لینے کی عورت سے اجازت لینا ضروری نہیں کیونکہ وہ اکثر اجازت دینے میں شرماتی ہے اور اس میں گویا ایک طرح کی سزا بھی ہے کہ دیکھنے کے بعد پسند نہ آئی اور نکاح نہ کیا تو اس کی دل شکنی ہوگی اور وہ تکلیف محسوس کرے گی اس لئے ہمارے علماء نے کہا ہے کہ پیغام دینے سے پہلے ہی دیکھنا بہتر ہے تاکہ اگر نکاح نہ ہو تو بھی اسے کوئی خاص اذیت نہ پہنچے بر اس کے برعکس جب پیغام دینے کے بعد چھوڑے گا" (تو بہت اذیت پہنچے گی)

اس سلسلے میں ہماری گذارش والدین سے یہ ہوگی کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت ایسے نہج پر کریں کہ وہ بڑے ہو کر اچھی ازدواجی زندگی بسر کریں ۔ اور اولاد کو بھی جائز معیار بیوی کا مقرر کرنا چاہیئے اور والدین اولاد کی جائز خواہشات کی قدر کریں ۔ اور اولاد والدین کی جائز خواہشات کی قدر کریں تاکہ مستقبل کی زندگی ازدواجی سکون و اطمینان کے ساتھ بسر ہو سکے اگر ہمارے معاشرے میں دینی تعلیمات پر عمل ہونے لگے تو ان بے سکونیوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے اور ان تعلیمات پر عمل کرنے میں انسان مختار ہے مجبور نہیں ہے اور نہ ہی ایسا شکوہ کرنا چاہیئے ۔ اپنی کوشش کرنے کے بعد تقدیر پر راضی رہنا ہی منشاء شریعت ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ کسی کی کوشش و محنت کو ضائع بھی نہیں فرماتا ۔

کیا انسان برا عمل کر کے شیطان یا تقدیر کے ذمہ کر کے بری الذمہ ہو سکتا ہے ؟

سوال : محترم حسینی صاحب پچھلے دنوں ہمارے ہاں ایک قتل ہوا ہے قاتل گرفتار ہو جانے کے بعد کہتا ہے کہ مجھے شیطان نے ایسا کرایا حالانکہ میں کرنا نہیں چاہتا تھا اور اس کے علاوہ یہ بھی کہتا ہے کہ میرا نوشتہ تقدیر ایسا تھا کہ میں قاتل بنوں کیونکہ اس کی موت میرے ہاتھوں لکھی ہوئی تھی کیا قاتل کا ایسا کہہ کر سزا سے بچنا شرعی ہو سکتا ہے ؟ وضاحت فرمائیں ۔

جواب : سب سے پہلے شیطان کی حقیقت کا سمجھنا ضروری ہے ۔ شیطان محض قوت کا یا انسان ہی کے کسی رجحان کا نام نہیں ہے بلکہ وہ جنات میں سے ہے اور جن انسانوں کی طرح ایک مستقل مخلوق ہیں شیطان کو جسم پر قبضہ کر کے بالجبر کوئی کام کرا لینے کے اختیار نہیں دیئے گئے ہیں وہ صرف نفس کو ترغیب دینے ، اکسانے اور برے کاموں کی طرف مائل کرنے یا وساوس اور شبہات ڈالنے کا کام کر سکتا ہے ۔ انسان چاہے تو اس کی ترغیبات کو رد کر کے اپنے ارادے سے ایک راہ اختیار کر سکتا ہیں ۔ اسی لئے خیر و شر میں تمیز کرنے کے لئے عقل دی گئی ہے لہذا کوئی برا فعل کر کے شیطان کے ماتھے تھوپنا یا اس سے بری الزمہ ہو جانا یا قرار دیا جانا شریعت کے خلاف ہے اس کا شریعت

میں کوئی وجود نہیں ہے ۔

اللہ رب العزت نے قتل عمد کے بارے میں ارشاد فرمایا:

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق (الانعام ۱۵۲)

"اللہ تعالیٰ نے جس انسان کی جان کو محترم قرار دیا ہے اسے ناحق قتل مت کرو"۔

ومن یقتل مومنا متعمدا فجزاء ہ جھنم خالدافیھا و غضب اللہ علیہ ولعنہ

واعدلہ عذابا عظیما (النساء:۹۳)

"جو کوئی کسی مسلمان کو عمداً قتل کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہو گا اور اس پر لعنت کرے گا اور اس کے لئے دردناک عذاب تیار رکھے گا"۔

آیۃ سے ثابت ہوا انسان کو اختیار دیا گیا ہے اگر انسان نوشتہ تقدیر کے سامنے مجبور ہوتا تو اللہ رب العزت قرآن مجید میں اس کی مذمت نہ فرماتا اور عذاب کی وعید نہ سنائی جاتی۔ کیونکہ یہ حکمت کے خلاف ہے کہ ایک چیز میں انسان کو مجبور کرے پھر اس پر عذاب کی وعید فرمائے۔ بلکہ عذاب اسی چیز پر ہو جس کے بارے میں اختیار بھی دیا گیا ہو کرنے یا نہ کرنے کا اس کے بغیر وعید عذاب لغو ہو گی۔

لہذا ایسے شخص کا قتل کر کے یہ حیلہ جوئی، بہانے کرنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا یہ حیلہ جوئی، بہانے، فریب، دھوکہ دہی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پچھلے صفحات غور سے پڑھیں آپ اجازت، حکم مشیت کا فرق سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ افعال قبیح جن کی مذمت بار بار فرمائی ہے کیا اس کے مرتکبین پر راضی ہو سکتا ہے؟ ہر گز نہیں۔

کیا موجودہ اقتدار اللہ رب العزت کی رضا سے ہے؟

سوال: محترم حسینی صاحب پچھلے دنوں سے میرا اپنے بڑے بھائی سے جھگڑا ہو رہا ہے اس کا موقف ہے کہ کائنات میں کوئی پتہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا لہذا محترمہ بے نظیر بھٹو یا میاں نواز شریف کا برسرِ اقتدار آنا اللہ رب العزت کی رضا اور حکم سے ہی ہے اور وہ مثال یہ دیتا ہے کہ نوکر اسے رکھا جاتا ہے جسے پسند کیا جاتا ہے کیا اللہ رب العزت بغیر اپنی رضا کے اس کی حکومت برداشت کر لیتا ہے مجھے اس معاملے میں آپ کی مناسب علمی راہنمائی کی ضرورت ہے لہذا مہربانی فرما کر جواب سے

اس سلسلے میں ہماری گذارش والدین سے یہ ہوگی کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت ایسے نہج پر کریں کہ وہ بڑے ہو کر اچھی ازدواجی زندگی بسر کریں ۔ اور اولاد کو بھی جائز معیار بیوی کا مقرر کرنا چاہیئے اور والدین اولاد کی جائز خواہشات کی قدر کریں ۔ اور اولاد والدین کی جائز خواہشات کی قدر کریں تاکہ مستقبل کی زندگی ازدواجی سکون و اطمینان سے ساتھ بسر ہو سکے اور ہمارے معاشرے میں ایسی شرعی تعلیمات پر عمل ہونے لگے تو ان بے سکونیوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے اور ان تعلیمات پر عمل کرنے میں انسان مختار ہے مجبور نہیں ہے اور نہ ہی ایسا شکوہ کرنا چاہیئے ۔ اپنی کوشش کرنے کے بعد تقدیر پر راضی رہنا ہی منشاء شریعت ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ کسی کی کوشش و محنت کو ضائع بھی نہیں فرماتا ۔

کیا انسان برا عمل کر کے شیطان یا تقدیر کے ذمہ کر کے بری الذمہ ہو سکتا ہے ؟

سوال : محترم حسینی صاحب پچھلے دنوں ہمارے ہاں ایک قتل ہوا ہے قاتل گرفتار ہو جانے کے بعد کہتا ہے کہ مجھے شیطان نے ایسا کرایا حالانکہ میں کرنا نہیں چاہتا تھا اور اس کے علاوہ یہ بھی کہتا ہے کہ میرا نوشہ تقدیر ایسا تھا کہ میں قاتل بنوں کیونکہ اس کی موت میرے ہاتھوں لکھی ہوئی تھی کیا قاتل کا ایسا کہہ کر سزا سے بچنا شرعی ہو سکتا ہے ؟ وضاحت فرمائیں ۔

جواب : سب سے پہلے شیطان کی حقیقت کا سمجھنا ضروری ہے ۔ شیطان محض قوت کا یا انسان ہی کے کسی رجحان کا نام نہیں ہے بلکہ وہ جنات میں سے ہے اور جن انسانوں کی طرح ایک مستقل مخلوق ہیں شیطان کو جسم پر قبضہ کر کے بالجبر کوئی کام کرا لینے کے اختیار نہیں دیئے گئے ہیں وہ صرف نفس کو ترغیب دینے ، اکسانے اور برے کاموں کی طرف مائل کرنے یا وساوس اور شبہات ڈالنے کا کام کر سکتا ہے ۔ انسان چاہے تو اس کی ترغیبات کو رد کر کے اپنے ارادے سے ایک راہ اختیار کر سکتا ہیں ۔ اسی لئے خیر و شر میں تمیز کرنے کے لئے عقل دی گئی ہے لہذا کوئی برا فعل کر کے شیطان کے ماتھے تھوپنا یا اس سے بری الزمہ ہو جانا یا قرار دیا جانا شریعت کے خلاف ہے اس کا شریعت

میں کوئی وجود نہیں ہے۔

اللہ رب العزت نے قتل عمد کے بارے میں ارشاد فرمایا:

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق (الانعام ۱۵۲)

"اللہ تعالیٰ نے جس انسان کی جان کو محترم قرار دیا ہے اسے ناحق قتل مت کرو"۔

ومن يقتل مومنا متعمدا فجزاءه جهنم خالدا فيها وغضب الله عليه ولعنه واعدله عذابا عظيما (النساء: ۹۳)

"جو کوئی کسی مسلمان کو عمداً قتل کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہو گا اور اس پر لعنت کرے گا اور اس کے لئے دردناک عذاب تیار رکھے گا"۔

آیۃ سے ثابت ہوا انسان کو اختیار دیا گیا ہے اگر انسان نوشتہ تقدیر کے سامنے مجبور ہوتا تو اللہ رب العزت قرآن مجید میں اس کی مذمت نہ فرماتا اور عذاب کی وعید نہ سنائی جاتی۔ کیونکہ یہ حکمت کے خلاف ہے کہ ایک چیز میں انسان کو مجبور کرے پھر اس پر عذاب کی وعید فرمائے۔ بلکہ عذاب اسی چیز پر ہو جس کے بارے میں اختیار بھی دیا گیا ہو کرنے یا نہ کرنے کا اس کے بغیر وعید عذاب لغو ہو گی۔

لہذا ایسے شخص کا قتل کر کے یہ حیلہ جوئی، بہانے کرنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا یہ حیلہ جوئی، بہانے، فریب، دھوکہ دہی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پچھلے صفحات غور سے پڑھیں آپ اجازت، حکم مشیت کا فرق سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ افعال قبیح جن کی مذمت بار بار فرمائی ہے کیا اس کے مرتکبین پر راضی ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

کیا موجودہ اقتدار اللہ رب العزت کی رضا سے ہے؟

سوال: محترم حسینی صاحب پچھلے دنوں سے میرا اپنے بڑے بھائی سے جھگڑا ہو رہا ہے اس کا موقف ہے کہ کائنات میں کوئی پتہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا لہذا محترمہ بے نظیر بھٹو یا میاں نواز شریف کا برسرِ اقتدار آنا اللہ رب العزت کی رضا اور حکم سے ہی ہے اور وہ مثال یہ دیتا ہے کہ نوکر اسے رکھا جاتا ہے جسے پسند کیا جاتا ہے کیا اللہ رب العزت بغیر اپنی رضا کے اس کی حکومت برداشت کر لیتا ہے مجھے اس معاملے میں آپ کی مناسب علمی راہنمائی کی ضرورت ہے لہذا مہربانی فرما کر جواب سے

دونوں ؟

جواب: سب سے پہلے بات تو یہ ہے کہ ایسے معاملے میں جھگڑنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ محترمہ یا محترم کا برسرِ اقتدار آجانا حق و باطل کا امتیاز نہیں ہے نہ ہی دونوں اسلام کے علمبردار ہیں کہ ایک کی حمایت کی جائے تو دوسرے کی مزمت دونوں کی فقط کرسی (اقتدار) کی جنگ ہے ۔ وہ اپنی کرسی کے لئے اور وہ اپنی کرسی کے لئے دین کو استعمال کرتے ہیں لہذا آپ مہربانی فرما کر خواہ مخواہ آپس میں دشمنی نہ بڑھائیں کیونکہ دونوں ایک ہی دنیا کے درخت کی شاخیں ہیں وہ آپس میں اکٹھے ہو جائیں گے آپ آپس میں بھائی دور نہ ہوں باقی آپ کے محترم بھائی صاحب کو قرآن مجید کی جس آیت سے یہ اشکال ہوا ہے وہ درج ذیل ہے :

قل اللهم مالك الملك توتي الملك من تشاء و تنزع الملك ممن تشاء و تعز من تشاء و تزل من تشاء بيدك الخير انك علي كل شيء قدير (آل عمران: ۲۶: ۳)

"اے محبوب کہہ دیجئے ! اے دنیائے جہان کے مالک تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے حکومت چھین لے اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے ہر طرح کی بڑائی تیرے ہاتھ میں ہے "۔

اس آیت میں اللہ رب العزت کی مشیت بیان کی گئی ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ پوری کائنات مشیت خداوندی کے ماتحت ہی چل رہی ہے اس کا منکر کافر ہے اور اگر اس آیت کا مفہوم اللہ رب العزت کا حکم اور راضی ہونے کا لے لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا تاریخ عالم میں جن جن بادشاہوں (فرعون ، نمرود ، شداد ، ھامان وغیرہ) کی طرف سے جو ظلم و ستم ، کفر و ضلالت پھیلائی گئی وہ اللہ رب العزت کی طرف سے تھی کیونکہ بقول ان لوگوں کے اللہ تعالیٰ نے انہیں حکومت عطا کر کے مسلمانوں پر مسلط کیا تھا ۔ حق و باطل دونوں کو اللہ رب العزت کی رضا نصیب ہو تو پھر ان میں تمیز کیسے کی جائے گی ۔ ثواب کن کے لئے ہو گا اور عذاب کن کے لئے سمجھنے میں غلطی لگی ہے [illegible] کہ سب حکومتیں مشیت ایزدی کے ماتحت ہی قائم ہوتی اور ٹوٹتی [illegible]ہیں ۔ کیونکہ حکم اجازت ، ارشاد اور مشیت ، قدرت مختلف المعانی الفاظ ہیں اگر ان کے فرق کو ملحوظ نہ رکھا گیا تو پھر اللہ رب العزت کی طرف ظلم و زیادتی

قرآن مجید میں ہے اللہ رب العزت ظلم کرنے والا نہیں ہے اللہ رب العزت نے کفر سے برأت کا اظہار یوں ہے

ان تکفروا فان اللہ غني عنکم ولا یرضي لعبادہ الکفر وان تشکروا یرضہ لکم۔

"اگر تم کفر کرو گے بے شک اللہ تعالیٰ تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں سے کفر پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر بجا لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ اس وجہ سے تم پر راضی ہو گا اللہ رب العزت نے اچھائی کی نسبت اپنی طرف اور برائی کی نسبت لوگوں کی طرف کی ہے کیونکہ لوگوں کو مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اختیار دیا گیا ہے کہ حق و باطل میں کس کو منتخب کریں"۔

کسی شخص کو مجبور نہیں کیا جاتا کہ وہ فلاں کو منتخب کرے اور وہ فلاں کو منتخب نہ کرے ایسا نہیں ہوتا اگر ایسا ہوتا تو ثواب و عتاب عبث قرار پائیں گے لہذا آپ خود سوچیں کہ جن کے دورِ اقتدار میں دین کو مذاق بنایا جائے اسلامی شعائر مٹانے کی کوشش کی جائے اور سود کو قبول کر کے اللہ رب العزت کے ساتھ جنگ کا اعلان کیا جا رہا ہو کیا ایسے دورِ حکومت کو آپ اللہ رب العزت کی رضا سے سمجھ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ اللہ رب العزت دین کی مخالفت ہرگز ہرگز پسند نہیں کرتا آپ کتاب کے پچھلے صفحات بھی غور سے پڑھیں مسئلہ واضح ہو جائے گا باقی آپ موجودہ حکمران اور اپوزیشن کو بہتر سمجھتے ہیں اور ان دونوں کے دورِ اقتدار میں اسلام کی خدمات کو بھی دیکھ چکے ہیں میرا کچھ کہنا تحصیل حاصل ہو گا جہاں تک ان دونوں کے درمیان فرق کی بات ہے تو وہ ملک کی عوام بہتر جانتی ہے کہ ماضی میں میاں صاحب کا کردار قدرے بہتر رہا ہے اس کی مثال یوں پیش کی جا سکتی ہے کہ ایک برا کام دکھا کر کرتا ہے اور دوسرا وہی کام چھپا کر کرتا ہے کرتے دونوں ہیں لہذا ان دونوں کے اقتدار کو اللہ رب العزت کی اجازت و ارشاد و حکم سے تعبیر نہیں کر سکتے ماتحت مشیت باری تعالیٰ ضرور ہیں۔

کیا قادری صاحب کا الیکشن میں کامیاب نہ ہو سکنا تقدیر الٰہی سے ہے؟

سوال: محترم حسینی صاحب میرا ایک دوست روزانہ یہی کہتا رہتا ہے کہ اگر قادری صاحب اللہ رب العزت کو پسند ہوتے تو ضرور کامیاب ہوتے ان کا اتنے جتن لگانے کے

باوجود اقتدار میں نہ آسکنا ناپسند ہونے کی دلیل ہے اور ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ تقدیر کو بھی یہی منظور تھا کہ قادری صاحب اقتدار میں نہ آئیں کیا اس کی کوئی شرعی حیثیت ہے؟ مہربانی فرما کر جواب سے نوازیں؟

جواب: قادری صاحب کی علمی، دینی، تحقیقی، تعلیمی، تنظیمی خدمات کو سمجھنے کے باوجود ان کے کردار کا موجودہ حکمرانوں کے کردار کے ساتھ تقابل کرنا انتہائی ظلم و زیادتی ہے اور ان کا اقتدار میں نہ آسکنا اللہ رب العزت کے ناپسند ہونے کی دلیل بنا لینا بھی حماقت و جہالت ہے اگر اقتدار ہی حق کی علامت ہوتا تو پھر تاریخ اسلام میں بڑی بڑی شخصیات موردِ الزام ٹھہریں گی۔ حالانکہ اقتدارِ حق کی علامت نہیں ہے کیونکہ اکابرین دین و ملت اقتدار کے بغیر زندگی گزارتے رہے اور ساری زندگی وہ غلبہ اسلام کی جنگ بھی لڑتے رہے جب وہ کوششیں کرنے کے باوجود غالب نہ ہو سکے تو کیا ہم ان کو برا بھلا کہہ سکتے ہیں؟ کیا ہم ایسے احباب سے سوال رکھنے کا حق رکھتے ہیں؟ کہ اکابر صحابہ، اکابر اولیاء کے بارے میں کیا کہیں گے ان کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے تو آج ان کو کیوں الزام دیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اتنی ہے کہ کوئی شخص معصوم نہیں ہے۔ ہر شخصیت میں خیر و شر دونوں موجود ہوتے ہیں کہیں شر غالب اور کہیں خیر غالب ہوتا ہے۔ غلبہ حق کی بحالی کے لئے اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جزوی بگاڑ کی اصلاح کے لئے جزوی کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے اور کلی بگاڑ کی اصلاح کے لئے اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ موجودہ بگاڑ کلی ہے اور اس کے لئے اجتماعی کوششوں کی شدید ضرورت ہے بدقسمتی ہے کہ دینی قوتوں کا اتحاد نہ ہو سکا لیکن انفرادی کوششوں کا صلہ و اجر ضائع نہیں جاتا اللہ رب العزت دلوں کے حالات کو بہتر جانتا ہے کہ غلبہ حق کی بحالی کے لئے کون مخلص اور کون غیر مخلص ہے۔ اکثر اوقات ظاہر ہی باطن کی عکاسی کرتا ہے۔

قادری صاحب قبلہ سے مجھے بعض مسائل میں خود اختلاف ہے اور یہ اختلاف کوئی بڑی چیز بھی نہیں غلبہ حق کی بحالی کے لئے ان کی تڑپ قابلِ تحسین و آفرین ہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمانوں کو اقتدار نہ ملنا یعنی اسلام کا غالب یا مغلوب ہونا کن وجوہ کی بناء پر ہوا ہے یہ ایک الگ موضوع ہے جو ہم تحریک منہاج القرآن عروج و زوال کے تناظر کے باب قصور انقلاب میں کریں گے کہ غلبہ اسلام کا

نسل کیوں برقرار نہ رہ سکا۔ قادری صاحب کا الیکشن میں کامیاب نہ ہو سکنے وہ نوشتہ تقدیر، موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا بلکہ اس سلسلے میں ناقص منصوبہ بندی اور عوام کا قصور ہے کہ جس نے اپنے ارادہ و اختیار سے دینی قوتوں کو مسترد کیا۔ کیونکہ دینی قوتوں کا ماضی قریب میں کوئی خاص سیاسی کردار نہیں رہا۔

اسلام کی غلط تعبیر و تشریح کرنے سے عوامی ذہن یہی بن گیا ہے کہ اسلام دین نہیں مذہب ہے جو فقط نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا نام ہے اس وجہ سے سیاست میں علمائے کرام کا کردار سامنے نہ آسکا نظام انتخاب جو ہمیں انگریزوں سے وراثت میں ملا ہے اس کو بدلنے کی ضرورت ہے یہی نظام تمام خرابیوں کی جڑ ہے اس کو بدلنے کا اللہ رب العزت نے ہم تمام کو اختیار دیا ہے اسی اختیار ہی کی بناء پر حق و باطل کی معرکہ آرائی ہے اس نظام کا نہ بدلنا اور کامیابی کا نہ ہونا اللہ رب العزت کی رضا سے نہیں ہے نہ ہی ہمیں رضا الٰہی پر محمول کرنا چاہیئے یہ کہنا درست ہے موجودہ حالات سب اللہ تعالیٰ کے علم میں تھے اور اس کا نام تقدیر ہے تقدیر کا معنی مجبوری نہیں ہے جو سمجھا جاتا ہے۔

خودکشی اور تقدیر

سوال: محترم حسینی صاحب خودکشی کرنے والا ہمیں کرنے سے پہلے کہا کرتا تھا کہ میری موت میرے ہاتھوں سے لکھی ہوئی ہے لہذا میں نے اپنے آپ کو ختم کرنا ہے کیا ایسا شخص سزا سے بچ سکتا ہے؟ نیز اس کا نمازِ جنازہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ مہربانی فرما کر جواب سے نوازیں۔

جواب: خودکشی کرنا اللہ رب العزت نے حرام قرار دیا ہے اور اس کا حرام قرار دیا جانا انسانی اختیار کی دلیل ہے اور یہ اختیار ہی سزا کی دلیل ہے انسان کو مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اللہ رب العزت کے علم قدیم میں یہ سب کچھ تھا جو اب ہو رہا ہے۔ برا کام کرنے سے پہلے تقدیر کا حیلہ بہانا بنانا جھوٹ و فریب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ باقی جہاں تک نمازِ جنازہ کا تعلق ہے اس میں باہمی اختلاف ہے قابل ترجیح مسلک یہی ہے کہ اس کی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ مومن گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوتا اور جو شخص دائرہ اسلام و ایمان سے خارج نہیں ہوتا اس کے لئے مغفرت کی دعا جائز ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ خودکشی

معمولی لغزش نہیں ہے ۔ خودکشی ایک کبیرہ گناہ ہے احادیث صحیحہ میں اس پر دوزخ کی وعید مذکور ہے ۔

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا:

"کہ جس آلہ قتل سے کوئی شخص اپنی جان لیتا ہے دوزخ میں وہی اس کے لئے آلہ عذاب بن کر اس پر دائماً مسلط کر دیا جاتا ہے جس کے ذریعے سے وہ بار بار خودکشی کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے ۔ ایسا فعل انتہائی بزدلی اور اپنے پروردگار سے بدگمانی اور ناشکری پر دلالت کرتا ہے جو ایک مسلمان کے لئے کسی حال میں جائز نہیں ہے ۔

کیونکہ انسان اپنی جان کا خود خالق و مالک نہیں ہے جب چاہے جس طرح چاہے اسے ضائع کر دے اپنی ذات پر ملکیت حاصل نہیں ہے تاہم ایسا شخص اگر مسلمان ہے تو اس کا نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے اللہ رب العزت اسے معاف فرمانے پر قادر ہے خواہ سزا کے بعد ہی کیوں نہ معاف فرمادے لیکن خودکشی کرنے والے کا یہ کہنا کہ لکھا ایسا تھا غلط ہے ہاں یہ کہنا چاہیئے کہ اللہ رب العزت کے علم قدیم میں سب کچھ تھا کہ انسان دنیا میں کیا کیا کرے گا وہ آغاز و انجام جانتا تھا اور اسی کا نام تقدیر ہے تقدیر کا معنی یہ ہرگز نہیں ہے کہ اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہو ۔

نوشتہ تقدیر اور شہادت امام حسینؓ

سوال : محترم حسینی صاحب محرم الحرام میں آپ کی تقریر (بعنوان فلسفہ شہادت امام حسینؓ) سننے کا موقع ملا ہے جو ہمارے احباب نے بہت پسند کی ہے قرآن وسنت کے دلائل اور منطقی و عقلی دلائل نے تو تقریر میں رنگ بھر دیا تھا ۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کی نشست بھی بڑی کامیاب رہی تحریکی حوالے سے بڑا فائدہ ہوا ہے ۔

قادری صاحب کے حوالے سے شکوک و شبہات کا ازالہ کافی حد تک ہو گیا ہے آپ کے بعد ہم پر سوال کیا گیا ہے کہ جناب امام حسینؓ کی شہادت تو نوشتہ تقدیر سے ہوئی ہے جو کچھ ہوا ہے سب کچھ تقدیر ہی سے ہوا ہے ۔ یزید کا کوئی قصور نہیں ۔ لہذا لعنت نہیں کرنی چاہیئے ۔ مہربانی فرما کر جواب سے نوازیں تاکہ ان کا مناسب علمی جواب دیا جا سکے اور ہم جواب کو اشتہار کی صورت میں شائع کر کے مساجد میں آویزاں کریں گے ۔

جواب: حوصلہ افزائی کا شکریہ جناب امام حسینؓ کی شہادت عظمیٰ پر تقدیری اشکال کا انسداد کرکے یزید ملعون کو بری الزمہ قرار دے دینا پوری تاریخ عالم کو مسخ کر دینا ہے۔ بات فقط یزید کے بری الزمہ ہونے پر نہیں رکے گی بلکہ وہ باطل تمام قوتیں جو حق کے خلاف نبرد آزما ہیں ان کو بری الزمہ قرار دیا جائے گا گویا کہ اس طرح انبیاء کرامؑ کے مخالفین کو بھی بری الزمہ قرار دینا ہو گا۔ (فرعون، نمرود، ہامان، شداد، ابوجہل، وغیرہ وغیرہ)

بغض حسینؓ کی اشاعت کرنے والوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ہم تنہا حسینؓ کا بغض نہیں خرید رہے بلکہ ان تمام نفوس قدسیہ کا بغض خرید رہے ہیں جنھوں نے معرکہ حق و باطل میں نمایاں کردار ادا کیا ایسی ذہنیت کے لوگ تقدیر الٰہی کے جھوٹے حیلے اور بہانوں سے باطل قوتوں کو کبھی بھی بلند نہیں کر سکتے اور نہ ہی باطل اپنی سزا سے بچ سکتا ہے۔

باطل کے لئے اللہ رب العزت کی طرف سے اعلان ہے:

واملي لهم ان كيدي متين

ڈھیل دی جاتی ہے تاکہ باطل اپنی تمام سرکشیوں کے انجام تک پہنچ سکے ایسے نالائقوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ کے اس اعتراض سے دین دشمن عناصر کتنے خوش ہوئے ہوں گے کہ ہمارا وجود بھی ایک نعمت عظمیٰ ہے کیونکہ ہمارے بغیر بھی دنیا جی نہیں سکتی۔ تقدیر الٰہی کوئی انسانی فعل کی مجبوری کا نام نہیں ہے بلکہ اللہ رب العزت کے علم قدیم ازلی کا نام ہے کہ جو کچھ ہوا وہ سب کچھ اللہ رب العزت کے علم قدیم میں تھا ایسے لوگوں کو حق و باطل میں کامیابی کے اصول معلوم نہیں ہیں کہ ناکامی و کامیابی کسے کہتے ہیں لہذا یاد رہے کہ حق کی ناکامی اور باطل کی کامیابی اصلاً کوئی معنی نہیں رکھتی۔ کامیابی و ناکامی کا تعلق خود انسان سے ہے۔ ناکام وہ لوگ ہوتے ہیں جو حق کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اس کے فوائد و ثمرات سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے حق و صداقت ایک اصول ہے خواہ اسے ساری دنیا قبول کرے یا کوئی ایک شخص بھی قبول نہ کرے بہرحال حق و صداقت اپنی جگہ مسلم ہے اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کامیاب وہ انسان ہوں گے جو حق و صداقت کو حرز جان بنا لیں گے۔

دیکھیئے روشنی اپنی جگہ مسلم ہے ایک شخص اسے پسند نہیں کرتا ۔۔

انا ھدینا السبیل اما شکراً و اما کفوراً۔ (الدھر ۲۹: ۳)

"یقیناً ہم نے اسے راستہ دکھا دیا اب وہ شکر گزار ہو یا ناشکرا"۔

وھدینہ النجدین (البلد ۳۰: ۱۰)

"اور ہم نے انسان کو نیکی اور بدی دونوں واضح راستے دکھا دیئے ۔ نیکی و بدی کو اختیار کرنے کا تعلق تقدیر معلق سے ہے اور تقدیر معلق میں انسان مختار ہے مجبور نہیں ۔

ہدایت و گمراہی کو اختیار کرنے میں تقدیر مبرم اور تقدیر معلق کا تعلق یوں ہو گا۔

اللہ تعالیٰ خالقِ مخلوق ہونے کی وجہ سے مخلوق کے انجامِ خیر اور انجامِ شر کو جانتا ہے اللہ رب العزت نے اپنے علم میں جان لیا کہ جب میں جناب علی المرتضیٰؑ ابوبکرؓ و عمرؓ اور عتبہ ، عتیبہ ، شیبہ ، ابوجہل وغیرہ کو پیدا کروں گا تو ان میں سے کون ہدایت کو اپنائے گا اور کون کون اسے ٹھکرائے گا۔

پس اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں جانا کہ انجام یہ ہو گا اور اسے لوحِ محفوظ پر تحریر کر دیا اسے تقدیر مبرم کہتے ہیں اور ہدایت و گمراہی کی دو الگ راہیں یہ ان کے لئے تقدیر معلق کا درجہ رکھتی ہیں اور اللہ رب العزت کا جان لینا انسان کے مجبور ہونے کی دلیل نہیں ہے ۔

اللہ رب العزت کا علم تدریجاً نہیں ہے

سوال : محترم حسینی صاحب جواب ملا پڑھ کر کافی علمی تشفی ہوئی لیکن تقدیر مبرم اور تقدیر معلق میں اللہ رب العزت کا علم تدریجاً لازم آتا ہے تو کیا اللہ رب العزت کے لئے علم تدریجاً کا عقیدہ رکھنا درست ہے ؟

قدیم زمانے میں ہونا یزید کی مجبوری افعال نہیں ہے بلکہ وہ اپنے افعال میں مختار تھا یہاں پر یہ اشکال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت نے کربلا میں ایسی مظلوم دہائی کیوں ہونے دی ۔ ؟

اس کا صاف جواب یہی ہے کہ اللہ رب العزت بعد میں دین کا کام کرنے والوں کے لئے ان اکابر کی سیرت کو اسوہ کامل وحسنہ کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا ایسی شخصیات کی قربانیوں کو دلائل کے طور پر پیش کیا کہ اسلام کے نام پر کیا کچھ لٹایا جاتا ہے اور کیسے جانیں دی جاتی ہیں ۔ ظلم و ستم ، وحشت و بربریت ، ظلم وناانصافی کے خاتمے کے لئے قربانی حسین رضؓ درکار ہوتی ہے ۔

بعض لوگ یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے جناب امام حسینؓ کی مدد کیوں نہ فرمائی اگر فرمائی تو پھر وہ کیوں قربان ہو گئے ؟

یہ سوال اصل حقیقت کو نہ سمجھنے کی بناء پر ہوا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ظلم و ستم کا نام فتح و نصرت ہے اور خداداد قدرت و طاقت کے ساتھ اسلام و ایمان اور حق و صداقت پر قائم و ثابت رہتے ہوئے جان و مال اور اولاد تک قربان کر دینا عاجزی ہے ۔

اللہ رب العزت اس ذہنیت کی تردید فرماتا ہے :

ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم (محمد)

"اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے پاؤں حق پر ثابت کر دے گا"۔

وحشت و بربریت کے ساتھ فتح و غلبہ حقیقتاً غلبہ نہیں مغلوب ہونا ہے ۔ فاتح و غالب وہ ہے جو ظلم و ستم اور وحشت و بربریت کے خلاف عدل وانصاف اور نیکی کا علم بلند کرتا ہے اور دشمن کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے ۔ دشمن کی بے پناہ قوت و طاقت اس کے عزم و استقلال سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے اور وہ اپنے عمل سے ثابت کر دیتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاغوتی طاقت اس کے ہاتھ سے اس کے ایمان کو نہیں چھین سکتی یہاں تک کہ وہ ظلم وناانصافی کے ہاتھوں شہید ہو جاتا ہے ۔ یہ عاجزی نہیں ہے یہ شکست نہیں بلکہ فتح و کامیابی ہے ۔ آزمائش میں ثابت قدم رہنا اللہ رب العزت کی طرف سے انعام و اکرام ہے اگر ہم اس خود ساختہ تصور کی بناء پر جناب امام حسینؓ کے جہاد میں تائید ایزدی کی نفی کرتے ہیں تو پھر میرا ان احباب سے سوال ہے :

اللہ رب العزت فرماتا ہے انا لننصر رسلنا "بے شک ہم اپنے رسولوں کی ضرور مدد کرتے ہیں"۔

تو بتایئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے برحق رسول ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں اور بے شک ہیں تو پھر کفار کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی یا نہیں کی؟ جواب آپ کے ذہن میں ہے ہم لوگوں کا جو معیار ہے وہ مدد ہوئی یا نہیں؟ اگر کہو کہ نہیں تو اللہ تعالیٰ اور اس کے کلام کی تکذیب لازم آتی ہے اور اگر کہو تو پھر بتاؤ اللہ تعالیٰ جو تمام قدرتوں کا مالک ہے اس کی مدد کے ہوتے ہوئے کفار اتنی اذیتیں پہنچانے میں کیسے کامیاب ہوئے؟ اگر آنحضرتؐ کو کوئی قدرت حاصل نہ تھی اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر قادر تھا پھر ایسا کیوں ہوا؟

جناب امام حسینؑ کی شہادت مظلومہ پر منفی سوال کرنا حقیقتاً ذات نبوتؐ پر ہوگا اس کا تفصیلی جواب تو انوارِ نبوت جلد ثانی میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ جہاد کی تمام مصیبتیں برداشت کرنا ہمارے لئے نمونہ ہے کہ ایسی مشقتوں کے باوجود حق و صداقت کا علم کیسے بلند کیا جاتا ہے؟ اجر و استقامت کے ساتھ باطل کو کیسے پاش پاش کیا جاتا ہے تاکہ آنے والی مسلمان نسلیں اس راہ پر چل کر دین دشمن سامراج کا مقابلہ کر کے غلبہ حق کی بحالی کے لئے اپنی جانیں قربان کر سکیں۔ باقی رہا یزید ملعون پر لعنت کرنا تو اس پر تمام امت کا اجماع ہے کہ وہ لعنتی ہے۔ حضرت امام حسینؑ کی مظلومانہ شہادت پر آہ و بکا کرنا بہت بڑی عبادت ہے۔ یہی رونا عزاداری ہے اور اس رونے کا مقصد مظلوم کی حمایت ہے اور [illegible]

موسمی پیشن گوئیوں کی حقیقت

سوال: محترم حسینی صاحب ہمارے ایک مہربان دوست نے آپ سے سوال کیا ہے کہ جب تقدیر الٰہی لکھے جانے کا نام نہیں ہے تو پھر موسمی حالات کی پیشن گوئیاں کیوں کی جاتی ہیں؟ ان پیشن گوئیوں کی کہاں تک حقیقت ہے جواب سے نوازیں تاکہ [illegible] تک جواب پہنچا سکوں؟

جواب: محکمہ موسمیات کی طرف سے کسی علاقے میں بارش کا نہ ہونے کی پیشن گوئی [illegible] میں ہوتی بارش برسانے یا نہ برسانے میں محکمہ موسمیات کا کوئی عمل دخل نہیں [illegible] مختلف [illegible] سے مختلف مخصوص نشانات اور علامات کی بنیاد پر مفروضہ [illegible]

معلومات کا اظہار ہوتا ہے۔ بارش کا ہونا یا نہ ہونا تو نظام قدرت کا ایک حصہ ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر پیشن گوئیاں غلط بھی ثابت ہو جاتی ہیں اسی طرح ماہرینِ فلکیات چاند اور سورج کے گرہن کی پیشن گوئی کرتے ہیں یہ درست بھی ہوتی ہیں اور غلط بھی۔ چاند سورج کے بارے میں اللہ رب العزت نے فرمایا:

وجعل الليل سكنا والشمس و القمر حسبانا ذالك تقدير العزيز العليم (الانعام ۹۴)

"اور اس نے رات کو سکون کا ذریعہ بنایا اور سورج اور چاند کا ایک حساب مقرر کیا (ان دونوں اجرام کا نظام) ایک زبردست اور ہمہ دان ہستی کا مقرر کیا ہوا ضابطہ ہے"۔

والقمر قدرنہ منازل (یسٰین: ۳۹)

"رات اور دن کا ضابطہ اللہ تعالیٰ ہی بناتا ہے"۔

کائنات کا ہر وجود ایک معین و مقرر سمت کی جانب رواں دواں ہے اس سفر کے دوران پیش آنے والے واقع کی کوئی نہ کوئی علت اور غائیت ضرور ہوتی ہے۔

اللہ رب العزت نے ہر علت کے ساتھ معلول اور ہر سبب کے ساتھ مسبب کو لازم کر دیا ہے۔ اور جو لوگ اس کائنات کے کسی حصے یا کسی نظام کو جان جاتے ہیں ان کے واقعات کی رفتار کا رخ متعین کرنا اور ان کے وقوع کو ٹھیک ٹھیک گھڑیوں کے ساتھ کا جان لینا مستقل نہیں ہوتا لہذا ماہرینِ فلکیات اور ماہرینِ موسمیات اپنی پیشن گوئیوں کے ذریعے نظامِ کائنات کی سمت اور جہت کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ اور ایسا کر بھی نہیں سکتے یہ لوگ فقط علامات کو جان کر آنے والی ایک طے شدہ حقیقت کا اظہار کرتے ہیں یہ پیشن گوئیاں کسی واقع کا علم ہے اور یہ علم بھی ظنی ہوتا ہے۔

یہ جان لینا کسی واقع کا علم اس کے وقوع کی مجبوری اور قید نہیں بن سکتا پس اس طرح اللہ رب العزت کا علم کسی انسان کی مجبوری نہیں ہو سکتا۔

تقدیر کے بارے میں کرید کرید کر گفتگو کرنا منع ہے

سوال: محترم حسینی صاحب ہمارے علاقہ کے مولوی صاحب اکثر مسئلہ تقدیر پر تقریریں کرتے ہیں جس کی وجہ سے عوام الناس میں اس مسئلے کی نسبت شکوک و شبہات

"قال رسول اللہ صلي اللہ عليہ و آلہ و سلم ان اول ما خلق اللہ القلم فعل لہ اکتب
قال ما اکتب قال اکتب القدر . فکتب ماکان وما ھو کائن الی الابدر (رواہ الترمذي)
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ رب العزت نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا ۔ پھر اسے فرمایا لکھو: اس نے کہا کیا لکھوں ؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تقدیر لکھو تو اس نے وہ سب کچھ لکھ دیا جو کچھ ہو چکا تھا اور آئندہ ہو گا ۔

وہ احادیث جن میں تقدیر کے تبدیل ہونے کا بیان ہے

حدیث نمبر ۱ :

"قال رسول اللہ صلي اللہ عليہ و آلہ وسلم اللھم مصرف القلوب صرف قلوبنا علي طاعتك (رواہ المسلم)
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا دلوں کو پھیرنے والے اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے ۔ یعنی دعا تقدیر کو تبدیل کر سکتی ہے ۔

حدیث نمبر ۲ :

"قال رسول اللہ صلي اللہ عليہ و آلہ وسلم لا يزيد في العمر الا البر ۔ ولا يردّ القدر الا الدعاء ۔ وَاِنَّ الرجلَ لَيُحْرمُ الرزق بخطيئةٍ يعملـھا (رواہ ابن ماجہ)
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا عمر میں نیکی ہی کے ذریعے اضافہ ہوتا ہے اور تقدیر کو دعا ہی تبدیل کر سکتی ہے اور یقیناً آدمی اپنے گناہوں کی وجہ سے رزق سے محروم کیا جاتا ہے ۔

ان احادیث کو پڑھنے کی وجہ سے آپ کے ذہن میں سوال یہ پیدا ہوا کہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے تقدیر اٹل بھی ہو اور اس میں تبدیلی بھی ممکن ہو سکے ۔

علمائے اہل سنت نے ان احادیث میں تطبیق پیدا کرنے کے لئے تقدیر کی قسمیں بیان کی ہیں جن کی وجہ سے ان احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے اور تعارض و تناقض ختم ہو جاتا ہے ۔

۱- تقدیر مبرم

۲- تقدیر معلق

۱- تقدیر مبرم : مبرم برم سے مشتق ہے جس کے معنی پختہ ، مضبوطی ، اٹل ، تبدیل نہ ہونا کے آتے ہیں - (المفردات)

یعنی اس میں اٹل اور فیصلہ کن امور کا ذکر ہوتا ہے - پس جن احادیث میں تقدیر کے تبدیل نہ ہونے کا بیان ہے وہ تقدیر مبرم ہے مثلاً قیامت کا آنا ، لڑکا یا لڑکی ہونا وغیرہ -

تقدیر معلق : معلق تعلیق سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں لٹکانا ، وہ امور جو فیصلہ کن نہ ہوں بلکہ جن کا تعلق عمل سے ہو اچھا عمل ہوا تو نتیجہ اچھا اور برا عمل ہوا تو نتیجہ سزا یعنی جیسا عمل ویسا نتیجہ -

تقدیر مبرم اور تقدیر معلق کا خلاصہ

تقدیر مبرم کا تعلق اللہ رب العزت کی قدرت کے ساتھ ہے اور تقدیر معلق کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے - تقدیر مبرم میں انسان مجبور محض ہے اور تقدیر معلق کا

تعلق مخلوق کے ساتھ ہے - تقدیر مبرم میں انسان مجبور محض ہے اور تقدیر معلق میں انسان مختار ہے - تقدیر مبرم کے متعلق اللہ تعالیٰ کسی سے باز پرس نہیں فرمائے گا کیونکہ اس میں کسی انسان کا دخل نہیں - تقدیر معلق کے متعلق اللہ تعالیٰ باز پرس فرمائے گا کیونکہ اس میں انسان کے فعل کو دخل ہے - اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا :

قد جآءکم بصائر من ربکم فمن ابصر فالنفسہ ومَنْ عمی فعلیھا وماآنا علیکم بحیفظ - (الانعام ۷:۱۴)

"بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن نشانیاں آگئیں - تو جس نے آنکھیں کھول کر دیکھ لیا تو یہ اسی کے اپنے فائدے میں ہے اور جو اندھا رہا اس کا نقصان اسی کے ذمہ ہے اور میں تم پر نگہبان نہیں -

آنکھیں بند کر لیتا ہے تو اس کے نتیجے میں وہ ٹھوکر خود ہی کھائے گا ناکام وہ خود ہی ہو گا۔ روشنی کی ناکامی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ روشنی کی طرف چل کر جانا پڑتا ہے۔ ظلمت و تاریکی کے لئے کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا پڑتا لیکن جو کوئی دنیا میں روشنی (دین) پھیلانا چاہے اسے دیئے، چراغ، تیل کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ حق و باطل کی کشمکش کو قرآن مجید یوں بیان کرتا ہے۔

وما خلقنا السماء والارض وما بینھما لٰعبین ولو اردنا ان نتخذ لھوا لاتخذنہ من لدنا ان کنا فعلین بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق (الانبیاء)

"اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے اندر جو کچھ ہے اسے کھیل اور تماشے کی حیثیت سے پیدا نہیں کیا اگر ہم چاہتے کہ اسے سامان تفریح بنائیں تو ہم یقیناً (بغیر کسی حکیمانہ نظر کے) اسے ایسا ہی بنا لیتے بشرطیکہ ہم یہی کرنے والے ہوتے لیکن (ہم نے ایسا نہیں کیا) (بلکہ کائنات کو بڑے محکم اصول حکمت کے ساتھ بنایا ہے جس کے مطابق) ہم حق کو باطل سے ٹکراتے ہیں۔ پھر (حق) اور (باطل) کا سر کچل دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے جو لوگ تقدیر ہی کی آڑ میں یزید کو بری الزمہ قرار دیتے ہیں یہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے مقصد و مدعا کو دنیا سے اوجھل کرنا چاہتے ہیں کہ کس مقصد و مدعا کے لئے کربلا کے مقتل میں حضرت قاسمؓ، حضرت علی اکبرؓ کی جوانیاں بے گور و کفن ہوئیں"۔

حضرت علی اصغرؓ کے چھ ماہ کا بچپن خون آلود ہوا، حضرت عباس علمدار کے [illegible] قلم کئے گئے، حضرت زینب ثانیؓ کے گود کے ولارے لوٹ لئے گئے، حضرت ام ربابؓ حضر[illegible] ام لیلیٰؓ، حضرت فروہؓ کی جھولیاں بچوں کی رونقوں سے خالی ہو گئیں۔ یہ سب [illegible] حضرت امام حسینؓ نے لٹایا ایسی لازوال قربانی جو اسلام کی بقاء کے لئے دی گئی اس کو [illegible]غدار کرنا گویا کہ آج کے یزیدیوں کو سہارا دینا ہے۔ اس سلسلے میں تقدیر الٰہی کا معنی یہ [illegible]گا کہ حضرت امام حسینؓ کی جملہ قربانی اللہ رب العزت کے علم قدیم میں تھی۔

مقام و مرتبہ حسینؓ طے ہو چکا تھا حسینؓ کے لئے اس خونی منظر سے گزرنا [illegible] تھا لیکن یزید سب کچھ جانتا تھا کہ میں کس مقصد کے لئے لڑ رہا ہوں اور کس [illegible]ف لڑ رہا ہوں وہ بغض و حسد کینہ و عداوت کی آگ میں جلنے والا جانتا تھا کہ حسینؓ [illegible] کے نواسے ہیں۔ یزید کی شقاوت اللہ رب العزت کے علم قدیم میں تھی۔ علم

جواب: اللہ رب العزت کا علم تدریجاً نہیں ہے بلکہ تمام امور اور ان کے انجام وغیرہ کا جزوی و کلی مکمل علم ایک دم سے ہے ۔ یہ نہیں کہ اسے پہلے ایک چیز کا علم ہو پھر دوسری چیز کا بلکہ دفعتہً واحدۃً (ایک دم سے ہے) تقدیر معلق کے انجام کو بھی وہ شروع سے جانتا ہے اس کا معلق ہونا بندوں کی نسبت سے ہے ۔ اللہ رب العزت کی نسبت سے نہیں ہے لہذا اس سے کوئی نقص لازم نہیں آتا ۔ تبدیل ہو جانا بندوں کی نسبت سے ہے تاکہ بندے کے ارادے و عمل کا اختیار ثابت ہو جائے ۔

کیا اچھا عمل نہ کر سکنا توفیقِ الہی سے ہے ؟

سوال: محترم حسینی صاحب! میرے ایک دوست نماز نہیں پڑھتے اور جب میں ان کو پڑھنے کے لئے کہتا ہوں تو یہ جواباً فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے توفیق ہی نہیں دی میں کیا کروں ؟ اللہ تعالی نے چاہا ہی نہیں تو میرا کیا قصور ؟ اس کا یہ کہنا کہاں تک درست ہے ؟ مہربانی فرما کر جواب سے نوازیں تاکہ اسے سمجھا سکوں ۔

جواب: اللہ تعالی نے توفیق ہی نہیں دی نماز کس طرح پڑھیں اللہ تعالی نے چاہا ہی نہیں ہم زکوۃ کیسے دیں اس نے چاہا ہی نہیں ہم روزہ کیسے رکھیں؟ کیونکہ اگر وہ چاہتا تو ہم روزہ ضرور رکھ لیتے ۔ اس نے چاہا ہی نہیں ہم برے افعال سے بچیں اگر وہ چاہتا تو ہم ضرور بچ جاتے اس قسم کے تمام جملے موجب ہلاکت ہیں ۔ کیونکہ ایسے جملوں میں غلطی و گناہ کی نسبت اللہ تعالی کی طرف ہوتی ہے یہ اللہ رب العزت پر بڑا بہتان ہے ۔ قرآن مجید میں ہے :

"قل ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون ۔ (یونس ۱۲:۶۹)
"اے محبوب فرما دیجئے یقیناً جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بول کر بہتان باندھتے ہیں وہ (کبھی) کامیاب نہیں ہو سکتے ۔

اللہ رب العزت نے ہدایت و گمراہی کے راستے کھول دیئے ہیں ۔ تاکہ ہر شخص آزادی کے ساتھ جس کو چاہے قبول کرے ای اختیار و آزادی کی وجہ سے جزا و سزا ہوئی ۔

اللہ رب العزت ہر شخص کو ہدایت کی طرف بلاتا ہے اور ہدایت اسے نصیب ہوتی ہے جو اس کا طالب ہو ۔
اللہ یجتبی الیہ من یشآء و یھدی الیہ من ینیب (الشوریٰ: ۱۳)
"اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنے قرب کے لئے چن لیتا ہے اور اپنی طرف ہدایت فرماتا ہے ۔ جو اس کی طرف رجوع کرے "۔
اللہ رب العزت اپنی طرف رجوع کرنے والے بندے کو ہدایت سے ضرور نوازتا ہے وہ کسی کو مجبور نہیں کرتا ۔
لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت و یومن باللہ استمسک بالعروۃ الوثقی لا انفصام لھا ۔ (البقرہ: ۲:۲۵۶)

"دین میں زبردستی نہیں بے شک ہدایت گمراہی سے خوب واضح ہو چکی ہے پس جو شیطان کے حکم کا انکار کرے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے بے شک اس نے ایسا مضبوط ۔۔ تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں "۔

لہذا قرآن مجید کی آیات سے ثابت ہوا نیکی توفیق الٰہی سے نصیب ہوتی ہے جو نیکی کو پانے کی کوشش کرے بغیر کوشش کرنے کے توفیق الٰہی کا نہ ملنا خلاف عقل بھی نہیں ہے جس طرح پیٹ پالنے کے لئے تگ و دو کی جاتی ہے اسی طرح ہدایت کو پانے کے لئے بھی تگ و دو کی ضرورت ہے۔

برائی کر کے توفیق الٰہی کے نہ ملنے کی باتیں کرنا انتہائی حماقت ہے۔ ایسے غلیظ جملے کہنے سے انسان ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ لہذا آئندہ ایسے جملوں سے قطعی پرہیز کریں۔

گمراہی خلقاً منجانب اللہ ہے عملاً منجانب اللہ نہیں

سوال: محترم حسینی صاحب قرآن مجید میں ہے:

من یضلل اللہ فمالہ من ھاد (الرعد: ۳۳)

"جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں"۔

یہاں پر گمراہی کو منجانب اللہ کہا گیا ہے یعنی انسان گمراہی کرنے میں اللہ

تعالیٰ کی طرف سے مجبور ہے۔ کیا قرآن مجید کا یہی مفہوم ہے؟ [illegible] میں نے معنی کی وضاحت فرمائیں؟

جواب : قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے اصول تفسیر کا علم ضروری ہے کیونکہ ایک ایک لفظ کے کئی کئی معانی ہوتے ہیں ۔ انشاء اللہ ہم مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی میں تفصیلی بحث کریں گے ۔

قرآن مجید میں جہاں جہاں اضلال کی نسبت اللہ تعالٰی کی طرف ہوگی وہاں اضلال کے معنی گمراہ کرنے کے نہیں بلکہ "گمراہ پانے" کے ہوں گے ۔ جہاں ترجمہ میں گمراہ کرنے کے معنی لئے گئے ہیں وہ باعتبار تخلیق کے لئے گئے ہیں ۔

اللہ تعالٰی نے فرمایا :

ان علینا للھدیٰ (اللیل ۱۲ : ۹۲)

بے شک راہ دکھانا ضرور ہمارے ذمہ کرم پر ہے "۔

گمراہ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے احادیث میں بھی منع کیا گیا ہے۔

مختلف احادیث میں تطبیق کیسے ؟

سوال: محترم حسینی صاحب مجھے دینی کتب کے مطالعہ کا بے حد شوق ہے۔ الحمد للہ میرے پاس دو ہزار کتب پر مشتمل لائبریری ہے جس میں صحاح ستہ کا ترجمہ بھی ہے جس کو میں کافی بار پڑھ چکا ہوں۔ مسئلہ تقدیر کے بارے میں ترمذی شریف، بخاری شریف، مسلم شریف میں ایسی احادیث ہیں کہ جن کے مفہوم ایک دوسرے کے متضاد ہیں مثلاً ترمذی شریف اور بخاری شریف میں ہے کہ تقدیر ایسا نوشتہ ہے جو تبدیل ہونے والا نہیں اور مسلم شریف اور ابن ماجہ میں ہے کہ تقدیر بدل جاتی ہے لہذا مجھے ان احادیث کے متعلق مناسب راہنمائی کی ضرورت ہے کونسی احادیث ضعیف و کمزور اور کونسی احادیث صحیح ہیں ؟

جواب: سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تقدیر کے متعلقہ جتنی بھی احادیث وارد ہیں ان کے متعلق علماء محدثین نے کمزور و ضعیف نہیں کہا اکثر احادیث ثقہ راویوں سے منقول ہیں

جن دونوں طرح کی احادیث سے علمی مغالطہ پیدا ہوا ہے وہ یہ ہیں۔

وہ احادیث جن میں تقدیر کے تبدیل نہ ہونے کا بیان ہے

حدیث نمبر ۱:

"قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ سلم مامنکم من احدا الاقد کتب مقعدہ من النار او من الجنتۃ (رواۃ البخاری: ۲)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کا ٹھکانہ دوزخ یا جنت میں مقرر ہو چکا ہے"۔

یعنی ہر شخص کا دوزخی یا جنتی ہونے کا فیصلہ پہلے سے ہو چکا ہے۔

حدیث نمبر ۲:

کیا برائی کی تخلیق انسان کو عمل پر مجبور کر سکتی ہے ؟

سوال محترم حسینی صاحب! میرے ایک دوست روزانہ یہی کہتے رہتے ہیں کہ کتنا اچھا ہوتا کہ اللہ رب العزت برائی کو پیدا نہ فرماتا تاکہ سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر ہو جاتی کیا یہ کہنا درست ہے ؟

جواب : اصل میں عمل سے بچنے کے لئے ذہن میں شیطانی وساوس پیدا ہوتے رہتے ہیں ۔ جن سے بچنا چاہیئے کیونکہ محدود ذہنیت کی سوچ بھی محدود ہوتی ہے ۔ اللہ رب العزت حکیم ہے ۔ اور حکیم کا کوئی فعل بھی حکمت سے خالی نہیں ہے فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ جس کو ہم سمجھنے کی بجائے اس میں نقائص و عیوب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

اللہ رب العزت نے کائنات بنائی اور اس میں قسم قسم کی نعمتیں رکھیں تاکہ انسان ان سے فائدہ حاصل کر سکے اور ہمیشہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے ۔ اچھائی ہوتی اور برائی نہ ہوتی تو اچھائی کی کوئی قدر و قیمت نہ

ہوتی برائی کی تخلیق عمل پر کسی انسان کو مجبور نہیں کرتی بلکہ اچھائی و برائی حقیقتاً جنت و دوزخ کے وجود کا سبب ہیں اگر صرف اچھائی ہوتی تو انسان اچھائی کرنے پر مجبور ہو جاتا اور مجبوری باعثِ جزاء و سزا نہیں اور جب اعمال پر جزا ہی ختم ہو جاتی تو جنت و دوزخ کا وجود بے معنی ہو کر رہ جاتا کیونکہ جنت اچھائی کی جزاء ہے اور دوزخ برائی کی سزا ہے۔

برائی پر سزا اکتساباً ہے خلقاً نہیں ہے کیونکہ اس کو ہم عقل و شعور رکھنے کے باوجود کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کفار کو کفر پر مجبور نہیں کیا

سوال: محترم حسینی صاحب! پچھلے دنوں سورۃ بقرہ کی تلاوت مع ترجمہ کر رہا تھا آیت نمبر ۲ میں مجھے اشکال پیدا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو کفر پر مجبور کیا ہے (العیاذ باللہ) کیا یہ درست ہے؟

جواب: خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰٓی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔

"اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے؟۔

آپ نے یہ سمجھا ہے کہ مہر لگانے والا اللہ تعالیٰ ہے اور مہر کی وجہ سے ان میں ایمان لانے کی صلاحیت نہیں رہی۔ اس لئے وہ ایمان نہ لائے ہاں اگر ان کے دلوں پر مہر نہ ہوتی تو شاید وہ ایمان لے آتے۔

آپ کو قرآن مجید کا مقصد و مدعا سمجھنے میں غلطی لگی ہے اس وجہ سے آپ نے یہ مفہوم اخذ کیا حالانکہ اس طرح کی دوسری آیات کا بھی مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ رب العزت نے مہر لگا دی ان کے ایمان کے تمام دروازے بند کر دیئے۔

حقیقتاً مفہوم قرآنی یہ ہے کہ جب وہ کفار اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم ﷺ کی نافرمانی کرتے ہوئے کفر کی ایسی گہرائی اور دلدل میں پہنچے جہاں ان کے دل کفر کی تاریکیوں سے سیاہ ہو گئے اس مقام سے لوٹنا ان کفار کے

لئے ممکن نہ رہا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا کر اس بات کا اعلان فرمایا کہ "ان کے کفر کی تمام تاریکیوں کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ حق قبول کرنے کی صلاحیت گنوا بیٹھے ہیں"۔

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ۔

"بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی یعنی یہ ان کفار کے اپنے کئے کا انجام ہے"۔

اللہ رب العزت نے ان کو کفر پر ہرگز مجبور نہیں کیا ہاں وہ خالق ازل سے یہ جانتا تھا کہ کون کون کافر اپنے کرتوتوں کی بناء پر بنیں گے علم قدیم کی بناء پر یہ کفر پر مجبور نہیں کئے گئے۔ جس طرح کفر کی اتھاہ گہرائیوں کو پا لینے والا شخص ایمان قبول کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے اسی طرح جو لوگ نورِ ایمانی سے منور ہو جاتے ہیں تو انہیں بھی کوئی گمراہ نہیں کر سکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان سے کہا تھا:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ۔ (الحجرات: ۴۶)

"بے شک میرے خاص بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں۔ ہاں گمراہوں میں سے جو تیری پیروی کرے"۔

گمراہی خلقاً منجانب اللہ ہے عملاً منجانب اللہ نہیں

سوال: محترم حسینی صاحب قرآن مجید میں ہے:

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (الرعد: ۳۳)

"جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں"۔

یہاں پر گمراہی کو منجانب اللہ کہا گیا ہے یعنی انسان گمراہی کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجبور ہے۔ کیا قرآن مجید کا یہی مفہوم ہے؟ جو میں نے سمجھا ہے وضاحت فرمائیں؟

جواب: قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے اصولِ تفسیر کا علم ضروری ہے کیونکہ

ایک ایک لفظ کے کئی کئی معانی ہوتے ہیں ۔

قرآن مجید میں جہاں جہاں اضلال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو گی وہاں اضلال کے معنی گمراہ کرنے کے نہیں بلکہ "گمراہ پانے" کے ہوں گے ۔ جہاں ترجمہ میں گمراہ کرنے کے معنی لئے گئے ہیں وہ باعتبار تخلیق لئے گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہدایت و گمراہی دونوں کا خالق ہے باعتبار تخلیق گمراہی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو گی ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰي (الليل: ۱۳:۳)

"بیشک راہ دکھانا ضرور ہمارے ذمہ کرم پر ہے"۔

جب ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہوا تو پھر وہ لوگوں کو خود کیوں گمراہ کرے ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ کہ ایک چیز کی مذمت کر کے پھر اسے پسند کرے ۔

اللہ تعالیٰ نہ کسی کو زبردستی گمراہ کرتا ہے نہ زبردستی ہدایت دیتا ہے ۔ ہدایت و گمراہی کو اختیار کرنا انسان کا فعل ہے اور اسی پر جزاء و سزا ہے ۔

اور جس حدیث کا آپ نے ذکر کیا ہے :

الشقي من شقي في بطن امه والسعيد من سعد في بطن امه۔

"بدبخت ماں کے پیٹ میں بھی بدبخت ہے اور نیک بخت ماں کے پیٹ میں بھی نیک بخت ہے"۔

یہاں پر بھی یہ معنی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بدبختی یا نیک بختی پر مجبور کیا ہے ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے خالقِ کائنات اور وہ سب کے انجام و خاتمے کو جانتا ہے کہ فلاں شخص دنیا میں جا کر کیا کیا کریں گے اور کس خاتمے پر ان کی موت واقع ہو گی اس وجہ سے کہا گیا ۔ بندوں کو مجبور نہیں کیا گیا ۔

سیکورٹی گارڈ یا محافظ رکھنا توکل کے خلاف نہیں ۔ ہے

سوال : محترم حسینی صاحب ! جب موت کا وقت مقرر ہے ۔ ت ایک ۔ ٹ

بھی آگے پیچھے نہیں کیا جا سکتا تو پھر سیکورٹی گارڈ کیوں رکھے جاتے ہیں ؟
جواب : آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھی صحابہ کرام محافظ تھے اور وہ وقت تقسیم کر کے حفاظت کیا کرتے تھے ۔ قرآن مجید کی اس آیت کے اترنے پر محافظوں کی چھٹی کرا دی ۔

واللہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ۔
"محبوب اللہ تعالیٰ تم کو دشمنوں سے بچائے گا"۔

اور ہمارے لئے حکم قرآنی ہے ۔ خُذُوْا حِذْرَکُمْ "اپنی حفاظت کی تدبیر کرو"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ آپ اپنی زندگی کو محفوظ کرنے کے لئے تدبیر بھی نہ کریں تدبیر کرنا توکل کے خلاف ہے جب موت کا وقت مقرر ہے تو پھر معاش یعنی پیٹ پالنے کے لئے تگ و دو کیوں کی جاتی ہے ؟ کیا یہ تگ و دو کرنا توکل کے خلاف ہے ہرگز نہیں ۔ توکل تدبیر کرنے کے بعد ہے انسان سے جو کچھ ہو سکے وہ کر کے نتیجہ اللہ رب العزت پر چھوڑ دے کہ وہی قادر ہے اسی نے سب کچھ کرنا ہے ۔

جو شخص یہ جانتا ہے کہ فلاں گلی میں میرے دشمن ہیں اور وہ میری جان کے ایسے دشمن ہیں جو موقع کی تلاش میں ہیں کیا یہی توکل ہو گا ؟ کیا یہی عقلمندی ہو گی ۔ اس گلی سے یہ کہہ کر گزر جائے کہ زندگی و موت کا ایک دن مقرر ہے یہ توکل اور عقلمندی کے خلاف ہے ۔ حفاظتی تدبیر کر کے گزرنا ہی منشاء شریعت ہے اسی لئے اسلام نے جہاد کے لئے بھی اصول بیان فرمائے ہیں جس حوالے سے آپ نے ذکر کیا ہے ۔

ایسی شخصیات تو ملک و قوم کا عظیم سرمایہ ہوتی ہیں ۔ دین دشمن عناصر ملک میں افراتفری پھیلانے کے لئے انہیں ہی نشانہ تیر بناتے ہیں ان کی حفاظت تو شرعاً جائز ہے ۔ ایسے لوگوں کی حفاظت پر تو حکومت کو خود توجہ دینی چاہیئے ان بزرگوں کی حفاظت کرنے والے محافظین

ثواب پاتے ہیں اگر نیت واقعی درست ہو تو انہیں اللہ رب العزت ضرور نوازتا ہے ۔ باقی ہمارے ہاں تو اکثر سیکورٹی گارڈ نمود و نمائش کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ اور ایسا کرنے والوں کو اپنے آپ کا محاسبہ کرنا چاہیئے۔

نبوت دعا کرنے سے نہیں مل سکتی

سوال : محترم حسینی صاحب! میرے ایک قادیانی دوست ہیں جن کو میں نے شروع دن سے بحث و مباحثہ کرنے سے روک دیا تھا جس کی ہم دونوں نے کافی پابندی کی ۔ کیونکہ قرآن مجید کا حکم ہے :

لَا اِکْرَاهَ فِي الدِّیْنِ۔ "دین میں جبر نہیں ہے"۔

لہذا ایک دن اس نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ :

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔

ایک سیدھے راستے کے طلب کرنے کے لئے دعا ہے تو کیا اس دعا کے ذریعے سے نبوت بھی مل سکتی ہے ؟ مہربانی فرما کر اس کے ممکنہ خدشات کا ازالہ فرماتے ہوئے جواب سے نوازیں ؟

جواب : نبوت و رسالت کا تعلق موہبت ہے ۔ یعنی نبوت و رسالت عمل کرنے سے نہیں ملتی اور نہ ہی یہ اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کی دعا میں شامل ہے ۔

اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ میں نبی و رسول کے راستے پر گامزن ہونے کی طلب ہے نہ کہ خود نبی بننے کی ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر عمل کرنا ہی امتی کے لئے بڑا اعزاز ہے نبوت میں انسان کی جدوجہد و سعی کو کوئی دخل نہیں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا :

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔

"یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ وہ اپنی نبوت و رسالت کس کو عطا کرے"۔

نبوت و رسالت خاندانی شرافت ، قوم کی سرداری اور مالداری کے ذریعے حاصل ہونے والی متاع نہیں اور نہ ہی انسان کو اس کے حاصل کرنے کا اختیار دیا گیا ہے ۔ کتنے ہی کمالات حاصل کر لینے کے بعد بھی کوئی اپنے اختیار سے یا زہد و عبادت کے زور سے نبوت و رسالت حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ نبی و رسول مامور من اللہ ہوتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ انہیں ازل سے تاجِ نبوت عطا کرتا ہے ۔ آیۃ میثاق میں مکمل وضاحت کی گئی ہے لہذا نبوت و رسالت کا تعلق کسب سے نہیں ہے ۔

نبوت و رسالت اختیاری چیز نہیں ہے کہ جس کو علمی ، عملی کمالات یا مجاہدہ و ریاضت یا دعاؤں وغیرہ کے ذریعے حاصل کیا جا سکے ۔ مجاہدہ و ریاضت پر ولایت کے درجات تو حاصل کیئے جا سکتے ہیں نبوت و رسالت ہرگز نہیں ۔ اصول و کلیہ یہی ہے کہ نبوت و رسالت کا تعلق وہب سے ہے کسب سے نہیں ۔ اور دعا کا تعلق امور کسبیہ میں ہوتا ہے ، جیسے کوئی اپنے اختیار سے سید نہیں ہو سکتا پس اسی طرح نبی و رسول بھی نہیں ہو سکتا ۔

میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ ایسی دوستی کو ترک کر دیں جو خطرہ ایمان کا سبب ہو کیونکہ اچھی صحبت کے اثرات اس وقت تک مرتب نہیں ہوتے جب تک انسان بری صحبت کو ترک نہ کر دے ۔

لہذا آپ ایسی صحبت سے پرہیز کریں مہربانی ہو گی ۔ گمراہ لوگ ہمیشہ موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں ۔ محبت و پیار کے طریقے میں ایمان پر حملہ کرتے ہیں ان کا یہی طریقہ واردات ہے کہ خدمت وغیرہ کر کے ایمان کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتے ہیں ۔ اپنا بنانے کے لئے پہلے پہل مادی فوائد و ثمرات مہیا کرتے ہیں پھر نورِ ایمان کو لوٹتے ہیں یہ لوگ منہ کے بڑے میٹھے ہوتے ہیں ۔ خیال کریں ۔

مرزا غلام احمد قادیانی اپنی تحریروں کے آئینے میں کذاب ہے ان سے گفتگو کرنے کے لئے ہمیشہ یہی طریقہ بہتر ہے کہ نبی جھوٹا نہیں ہو سکتا تو پھر مرزا قادیانی تو نت نئی بات کرنے کا عادی تھا اور اس کی تحریروں میں

سر کے بالوں سے بھی زیادہ تضاد ہے اور جس کی باتوں میں تضاد ہو وہ کبھی نبی نہیں ہو سکتا۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ کریں ۔ اور پھر ان کی کتابوں کے آئینے میں ان کا کذب بیان کیا جائے۔ باقی ان سے دلیل طلب کرنا بالکل غلط ہے۔

سوال : محترم حسینی صاحب! میرے ایک عزیز کا یہ عقیدہ بن گیا ہے کہ علمی و عملی کمال انسان کو وراثت میں ہی ملتے ہیں گویا کہ صاحبانِ عقل و دانش وہی ہوا کرتے ہیں جن کے والدین ذہین و فطین ہوتے ہیں لہذا مہربانی فرما کر میرے عزیز کے لئے مفید باتیں لکھیں تاکہ وہ سکون و اطمینان حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم کی طرف توجہ دے۔

جواب : ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

"علمی و عملی کمال اللہ رب العزت کا فضل ہے جسے چاہے عطا کرے یعنی یہ اللہ رب العزت کی کرم نوازی پر منحصر ہے اور اللہ رب العزت کی ذات کسی انسان کی محنت کو ضائع نہیں کرتی۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ۔

جتنی محنت ہوگی اسی حساب سے نتیجہ و ثمرہ ہوگا"۔

نفسیات کی کتابیں پڑھنے سے وقتی طور پر غلبہ ہو جاتا ہے لہذا حد سے زیادہ نفسیات کی کتابیں پڑھنے سے گریز کرنا چاہیئے کیونکہ طلباء پختہ مزاج و عقل نہ ہونے کی وجہ سے ذہنی طور پر مریض ہو جاتے ہیں۔

بہر حال ماحول کا کافی اثر ہوتا ہے بالخصوص والدین کے مزاجوں کا اولاد پر اثر ضرور ہوتا ہے لیکن اسے کلیہ و قاعدہ نہیں بنایا جا سکتا کہ نیکوں کی الاد کا نیک ہونا لازمی ہے اور بروں کی اولاد کا برا ہونا لازمی ہے۔ اس کے خلاف ہونے میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ بعض اوقات اچھے لوگوں کی اولاد نامراد ہو جاتی ہیں اپنے عمل و کردار کی وجہ سے ان میں والدین کا کوئی قصور نہیں ہوتا اور کبھی بروں کی اولادیں اچھی رفاقتوں کے ملنے کی وجہ سے سنور جاتی ہیں۔

لہذا میرے اس دوست کو محنت کرنی چاہیئے اور محنت کا پھل ضرور

ملتا ہے۔ جتنے بھی لوگ نامور ہوئے ہیں سب محنت کی بناء پر ہوئے کیونکہ محنت کرنا اللہ تعالی کا بڑا فضل ہے۔ لہذا انہیں ڈٹ کر محنت کرنی چاہیئے مایوسی وناامیدی اچھی نہیں ہے۔ صبح وشام ایک سو ایک (۱۰۱) بار اول و آخر تین بار درود شریف کے ساتھ یہ پڑھیں:

رَبِّ زِدْنِيْ عِلْماً وَّ حِلْماً وَّتَقْوٰى الصَّلٰوةُ والسَّلَامُ عليك يارسول الله صلى الله عليه وآله وسلم۔

اللہ تعالی بصدقہ محمدؐ و آلِ محمدؐ کرم فرمائے گا۔ اور ساتھ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْلِيْ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ کو بھی اسی تعداد کے ساتھ

اضطراری حالات میں انسان کی ذمہ داری وجوابدہی ختم ہوجاتی ہے

(سوال) محترم حسینی صاحب: کیا اضطراری حالات میں انسان سے جوابدہی ہوگی؟ مہربانی فرماکر جواب سے نوازیں۔

(جواب) انسان اپنی فطرت پر غور کرے تو اسے اپنے مختار یا مجبور ہونے کا جواب اپنی فطرت سے مل جائیگا۔ ہر شخص بغیر کسی غور وفکر کے محض اپنی فطرت پر یہ تصوّر رکھتا ہے۔ کہ انسان اپنی ارادی حرکات وسکنات میں آزاد ہے۔ اور جو فعل اپنے ارادہ واختیار سے کرتا ہے اسکے علاوہ وہ ذمّہ دار وجوابدہ ہے۔ اچھے افعال وکردار لیئے جزا وانعام کا مستحق ہے۔ اور برے افعال کے لئے ملامت اور سزا کا مستوجب۔

فطرت کے اس تصور میں اس خیال کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ کہ انسان اپنے سوچے سمجھے افعال واعمال میں کسی خارجی یا باطنی قوّت سے مجبور ہوتا ہے۔ جہاں فی الواقع مقہوری ومجبوری کے آثار نظر آتے ہیں وہاں ارادہ واختیار کے بجائے اضطراری وبے اختیاری کا حکم لگایا جاتا ہے۔

اضطراری حالات میں انسان کی ذمہ داری وجوابدہی ختم ہوجاتی ہے۔ مدح وذم اور جزا وسزا کا استحقاق باقی نہیں رہتا۔ اور ایسے حالات میں انسان کے

نیک یا بد، اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جاتا۔
انسان کی فطرت اضطراری حالات کا بھی خود جواب دیتی ہے ۔
مثلاً۔
اگر کوئی ذی عقل شخص کسی کو پتھر مارے یا گالی دے تو اس کے دل میں یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ اس نے یہ فعل کسی طاقت کے جبر سے کیا ہے ۔ اور اسی لئے وہ اس کو ذمہ دار قرار دے کر جواب میں پتھر یا گالی سے اس کی تواضع کرتا ہے ۔ لیکن اگر وہی شخص، پاگل، دیوانہ ہو تو اس کی گالی، پتھر کو کوئی بھی اس کے ارادہ واختیار پر محمول نہیں کرتا بلکہ اسے مجبور و مقہور قرار دے کر تمام افعال کی ذمہ داری سے بری سمجھتا ہے ۔
ہم ایک بچے یا دیوانے کو اس کے برہنہ پھرنے پر کبھی ملامت نہیں کرتے ۔
مگر ایک عاقل بالغ آدمی بحالت عریانی باہر نکل آئے تو اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔
کسی شخص کا منہ قدرتی طور پر خراب ہو تو کوئی اسے دیکھ کر نفرت نہیں کرتا۔ لیکن اچھے خاصے منہ والا ہمیں دیکھ کر منہ چڑائے تو ہمیں ناگوار گزرتا ہے ۔ اندھا آدمی اپنی چیز کے بجائے کسی دوسرے کی چیز اٹھا لے تو ہم اس پر چوری کا الزام نہیں لگاتے ۔ مگر آنکھوں والا یہی حرکت کرے تو اسے فوراً پکڑ لیتے ہیں ۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں بھلے اور برے دونوں کی تمیز ودیعت فرمادی ہے ۔
فالھمھا فجورھا و تقوٰھا (۸:۳۰)
میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان فطرتاً افعال پر جزا و سزا کا حکم لگاتا ہے۔
اور جن حالات کو مجبوری و مقہوری سمجھتا ہے ۔
شریعت بھی اس کی تصدیق کرتی ہے ۔ گویا کہ اضطراری حالات میں حکم بدل جاتا ہے ۔ اور جوابدہی و ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے ۔

عمومی حالات کا حکم مجبوری و مقہوری پر نہیں لگایا جاسکتا۔ اور مجبوری و مقہوری حالات والا حکم عمومی حالات کے لیئے باقی نہیں رکھا جاسکتا۔
اضطراری حالات کو بھی دیکھا جاتا ہے ۔ اگر فی الواقع وہ ایسے ہیں تو حکم بدلا جائے گا ورنہ نہیں ۔

سوال : محترم حسینی صاحب ! میرے ایک دوست کہتے ہیں کہ ائمہ اہلبیت کو اللہ تعالیٰ نے ازل سے امامت سے نواز کر ہماری رشد و ہدایت کے لئے بھیجا ہے کیا ایسا عقیدہ رکھنا درست ہے ؟
جواب : اللہ تعالیٰ ازل سے پوری کائنات کو جانتا ہے کہ کون کون دنیا میں رشد و ہدایت کے مینارۂ نور ہوں گے اس علم قدیم ازلی کے حوالے سے سب متقین سلف صالحین یکساں و برابر ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو رشد و ہدایت پھیلانے سے پہلے جانتا تھا اس میں صحابہ کرام ائمہؑ اہلبیت کرامؑ وغیرہ سب شریک ہیں ۔

جہاں تک ائمہ اہلبیتؑ کے مامور من اللہ ہونے کا تعلق ہے تو اس میں اختلاف پایا جاتا ہے کیونکہ اسی بحث میں مسئلہ عصمت آجاتا ہے جو خاصہ نبوت ہے ۔ یہ مسئلہ خلافت و امامت شیعہ سنیوں میں وجہ اختلاف بنا ہوا ہے ۔ کیونکہ اس مسئلہ میں اصولی و بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے ۔ اگر خلافت و امامت کو مامور من اللہ کہا جائے تو پھر انتخاب خلفاء راشدینؓ پر جو یک [illegible] حقیقت ہے اس پر زد پڑتی ہے ۔ اور اگر بغیر کسی حکومت و امارت کے [illegible] دینی بنیاد پر امامت و مامور من اللہ کہا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ۔ جس طرح خلفاء راشدینؓ کی خلافت برحق ہے اسی طرح ائمہ اہلبیت علیہم الرضوان کے زہد و تقویٰ و خلوص و رعا ، رشد و ہدایت کے میدان میں امامت بدرجہ اتم برحق ہے ۔ حضرت امام حسنؓ کے بعد باقی ائمہ اہلبیتؑ بھی ظاہری حکومت یعنی خلافت کے اہل تھے بلکہ ان کا حق تھا جو بنی امیہ اور بنی عباس کے بادشاہوں نے ان ائمہ اہلبیتؑ اطہار پر ظلم کر کے ان کو خلافت سے دور رکھا جو ظلم و ستم روا رکھا گیا تاریخ کے اوراق اس ظلم و ستم

سے خون آلود ہیں۔

باقی یہ ظاہری حکومت کے بغیر بھی اللہ تعالیٰ اور متقی و پرہیزگار لوگوں کے نزدیک خلیفہ برحق تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسباً و حسباً جو قرابتیں انہیں نصیب ہیں امت میں اور کسی کو بھی نصیب نہیں۔ لہذا تقرب نبویؐ کی بناء پر ان ائمہ اہلبیتؑ کو باقی تمام سے زیادہ عصمت کی خیرات نصیب ہوئی جس کا ذکر آیۃ تطہیر میں اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔

ان ائمہ اہلبیت عظامؓ کو یہ عصمت ذاتی نہیں بلکہ تقرب نبویؐ سے دوگانہ نسبتوں کی بناء پر نصیب ہوئی ہے۔ اور صحابہ کرامؓ کو حسباً تقرب نبوی نصیب ہے اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ فَبِاَیِّھِمْ اِقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ۔

اسی وجہ سے کسی صاحب بصیرت نے کہا کہ

اصحاب رسولؐ در والے

اور آل رسولؐ گھر والے ہیں۔

سوال: محترم حسینی صاحب! کیا یہ حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ انسان جس مٹی سے پیدا ہوتا ہے وہیں پر مدفون ہوتا ہے؟ اگر درست ہے تو مہربانی فرما کر وضاحت فرمائیں؟

جواب: فتاویٰ افریقہ میں اعلحضرت الشاہ امام احمد رضا خان صاحب بریلوی نے یہ حدیث نقل کی ہے:

ویاخذ التراب یدفن فی بقعة و تعجن بنطفته فذلک قوله تعالی منها خلقنکم و فیها نعیدکم۔ (فتاوی افریقہ ۸۵)

"فرشتہ وہاں کی مٹی لیتا ہے جہاں اسے دفن ہونا ہے اسے نطفہ میں ملا کر گوندھتا ہے یہ ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ زمین ہی سے ہم نے تمہیں بنایا اور اسی میں پھر تمہیں لے جائیں گے"۔

اس حدیث کو خطیب بغدادی اپنی کتاب "المتفق والمفترق" میں بھی
نقل کیا ہے ۔ محدثین عظام کے نزدیک یہ ثقہ روایت ہے اس کو اکثریت
اہلِ علم قبول کرتی رہی ہے پس انسان کی تخلیق اور قبر کا خمیر ایک ہی ہوتا ہے ۔
انسان جہاں کہیں دفن ہوتا ہے یہ سب کچھ تقدیرِ الٰہی سے ہوتا ہے ۔ اللہ
تعالیٰ کے علم میں تھا کہ انسان کس خطہ زمین میں پیدا ہوگا اور کس خطہ زمین
میں دفن ہوگا۔

مندرجہ بالا حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ
حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ گنبدِ خضریٰ میں مدفون ہیں ۔ ان
دونوں بزرگوں کا گنبدِ خضریٰ میں دفن ہونا اس چیز کی دلیل ہے کہ یہ جنتی ہیں
کیونکہ جنتی ہی جنت کے مقام میں داخل ہو سکتا ہے ۔ گنبدِ خضریٰ میں
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما ہیں ۔ لہذا اس وجہ سے عرشِ
معلی حملۃ العرش ، جنت عدن افلاک ، دائرہ سب مل کر بھی روضہ مطہرہ کی
برابری نہیں کر سکتے ۔ گنبدِ خضریٰ میں جلوہ افروز ایسا وجود مسعود اور فائز
الحیات ہے جو پوری کائنات کی تخلیق کا سبب ہے ۔ اور اس صحبت و رفاقت
میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کو اعزاز حاصل ہے جو تمام صحابہ
کرامؓ میں کسی کو بھی نصیب نہیں ہے ۔ لہذا یہ دونوں بزرگ صحابہ کرامؓ میں
افضل قرار پائے ۔

سوال : محترم حسینی صاحب! میرا ایک دوست کہتا ہے کہ پوری کائنات
مسلمانوں کے لئے مسجد ہے لہذا جو جہاں کہیں بھی دفن ہوگا وہ سب یکساں
اہمیت کی جائے مدفن ہوگی کیا سب مقام یکساں و برابر ہیں ؟

جواب: اسکے اندر کوئی شک نہیں کہ پوری کائنات مسلمانوں کے لئے پاک
ہے لہذا اسے مسجد بنایا جا سکتا ہے یعنی ہر جگہ نماز ادا کی جا سکتی ہے لیکن اس
ضمن میں پوری کائنات کو یکساں فضیلت حاصل نہیں ہے جیسے نفسِ نبوت
میں تمام انبیاء و رسل ایک ہیں لیکن مقام و مرتبہ میں فرق ہے ۔ پس اسی
طرح پوری زمین نفسِ طہارت میں تو ایک ہے لیکن بعض مقامات کو بعض

مقامات پر فضیلت حاصل ہے ۔ جیسے اپنے گھر سے زیادہ فضیلت کی حامل مسجد ہے اور عام مسجد سے زیادہ فضیلت کی حامل جامع مسجد ہے جہاں نمازِ جمعہ ادا کیا جاتا ہے ۔

اس طرح پوری مساجد میں مسجدِ حرام افضل ہے اور ان سب مساجد میں مسجدِ نبوی افضل ہے ۔ اور مسجدِ نبوی کی فضیلت کا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرب ہے اس اعتراض کے پیچھے اعتقادی خرابی ہے جو ہماری خودساختہ ہے ۔ حالانکہ قرآن و سنت کی تصریحات کے مطابق ایک مقام کو دوسرے مقام پر فضیلت حاصل ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر حج بیت اللہ کی سعادت گھروں میں ہی بیٹھ کر حاصل ہو جاتی ۔ جو حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔

مسئلہ تقدیر اور ضبطِ ولادت

سوال : کیا عزل اور منصوبہ بندی تقدیر کے منافی ہے ؟

جواب : حضرت ابو سعید خدری ؓ سے روایت ہے :

كنا تعزل فسالنا رسول الله صلي الله عليه وآله وسلم فقال اوانكم تفعلون ؟ قالها ثلثا مامن نسمة كائنة الي يوم القيامه الاوهي كائنة (رواه البخاري)

"ہم لوگ عزل کیا کرتے تھے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بارے میں دریافت کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین بار فرمایا ! کیا تم واقعی ایسا کرتے ہو ؟ پھر فرمایا قیامت تک جو روح آنے والی ہے وہ آکر رہے گی "۔

یہی مفہوم حضرت ابو سعید خدری ؓ سے پندرہ اسانید اور مختلف الفاظ سے مسلم میں بھی موجود ہے ۔ مسلم کی چار پانچ روایات میں اس مضمون سے پہلے یہ الفاظ ہیں ۔

لاعليكم الاتفعلوا۔

"اگر تم عزل نہ کرو تو تمہارا کوئی نقصان نہیں (کیونکہ آنے والی روح آکر رہے گی)

امام نووی نے اس کی شرح یوں کی ہے :

قوله عليه السلام لا عليكم الا تفعلوا ما كتب الله خلق نسمة هي كائنة الى يوم القيامة الا ستكون معانه ماعليكم ضرر في ترك العزل لان كل نفس قدر الله

تعالیٰ خلقہ لابدان یخلقھا سواء عزلتم ام لاہ ۔ ومالم یقدر اللہ خلقھا لایقع سواء عزلتم لافلافائدۃ فی عزلکم۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان (لاعلیکم الاتفعلوا) کا مطلب یہ ہے کہ ترک عزل میں تمہارا کوئی نقصان نہیں کیونکہ جس روح کی آفرینش کو اللہ رب العزت مقدر کر چکا ہے اسے تو وہ پیدا کر کے ہی رہے گا خواہ تم عزل کرو یا نہ کرو اور جس کی آفرینش کو اللہ رب العزت نے مقدر نہیں کیا وہ وجود میں نہیں آئے گا خواہ تم عزل کرو یا نہ کرو اس لئے تمہارے عزل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں"۔

امام نووی کی شرح سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس کی ممانعت نہیں ہے بلکہ جائز ہے۔

دوسری روایت میں حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں:

سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن العزل فقال! مامن کل الماء یکون الولد لواراد اللہ خلق شیء۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عزل کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا ہر پانی سے تو اولاد نہیں ہو جاتی (یعنی جس طرح ہر مادہ تولید سے اولاد نہیں ہو جاتی اسی طرح ہر عزل سے اولاد رک نہیں جاتی بلکہ یہ تو قدرت کے کھیل ہیں جو اولاد مقدر ہوتی ہے وہ ہو کر رہتی ہے)

یہاں پر یہ تو بتایا گیا ہے کہ مقدرات کو عزل نہیں روک سکتا لیکن اس کی ممانعت نہیں کی گئی بلکہ اس میں ایک اور حقیقت بیان کی گئی ہے کہ ہر ونیفہ جنسی اولاد پیدا نہیں کرتا بعض ہی پیدا کرتا ہے اسی طرح ہر عزل اولاد کو نہیں روکتا بلکہ بعض روکتا ہے یعنی سینکڑوں جنسی اختلاط میں کوئی ایک اختلاط کامیاب ہو کر اولاد پیدا کرتا ہے اسی طرح سینکڑوں عزل میں کوئی ایک ہی عزل ناکام ہو کر اولاد کو وجود میں لے آتا ہے اور وہیں پر یہ عزل تقدیر کے سامنے بے بس اور بے فائدہ ثابت ہوتا ہے۔

اگر عزل ہمیشہ بے فائدہ ثابت ہوتا تو ایسے بے فائدہ فعل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واضح الفاظ میں روک دیتے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو یہ فرمایا کہ آنے والی روح تو آ کر ہی رہتی ہے اور تمہارا عزل اس وقت بے فائدہ ثابت ہوگا جو فی الواقع بے فائدہ کام ہوتا اور جس کا روکنا بھی ضروری ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم واضح الفاظ میں منع فرمادیتے ۔
عزل کلی اعتبار سے بے فائدہ ہوتا تو پھر اس وظیفہ جنسی سے بھی روک دیا جاتا جس سے اولاد کے نہ ہونے کا یقین ہوتا کیونکہ یہ تکلیف مالایطاق کسی کے بس کی بات نہیں ہے اولاد نہ ہونے کے یقین کے باوجود وظیفہ زوجیت ادا کرنے اور عزل کرنے میں فرق ہی کیا ہے ۔ جس طریقے پر عزل کو ناجائز قرار دیا جائے گا اسی طریقے پر وہ تمام وظائف زوجیت بھی ناجائز ٹھہریں گے جن سے اولاد نہ ہونے کا یقین ہوتا ہے حدیث کے یہ الفاظ "آنے والی روح تو آکر ہی رہے گی" درست ہے یہ ایک ایسی ابدی حقیقت ہے کہ جیسے یہ کہا جائے کہ نہ آنے والی روح کبھی نہیں آسکتی تو پھر کیا اس کا یہ مطلب مراد لیا جا سکتا ہے کہ وظیفہ زوجیت ادا کرنا بے معنی و بے فائدہ ہے کیونکہ جو روح کو آنا ہی نہیں ہے تو وہ آہی نہیں سکتی باتیں دونوں ہی اپنی جگہ مسلم ہیں ۔

آنے والی روح آکر رہے گی

اور نہ آنے والی روح نہ آکر رہے گی

یہ معاملہ تقدیر کا ہے اور خاندانی منصوبہ بندی کا تعلق تدبیر سے ہے انسان کا کام تدبیر کرنا ہے کوشش کرنا ہے آگے اسے نتیجے تک پہنچانا رب العالمین کا کام ہے اور اسی کا نام توکل ہے ۔ آنے والی روح آکر رہے گی نہ آنے والی کبھی نہیں آسکتی ۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ احتیاطی تدبیر و کوشش نہ کریں ۔ اگر کوشش کرنا اور تدبیر کرنا اللہ رب العزت کے نظام الوہیت میں دخل دینا ہے تو مرنے والے نے تو مرنا ہی ہوتا ہے اور جینے والے نے جینا ہی ہوتا ہے تو پھر ہم بیماری کے لئے علاج کیوں کرتے ہیں ؟ اور علاج پر ہزاروں روپے کیوں خرچ کرتے ہیں ؟ جب معلوم ہے کہ یہ بیماری موت کا سبب بننے والی ہے تو پھر عقل رکھنے کے باوجود در در کی ٹھوکریں کیوں کھاتے ہیں ؟ کیوں علاج کرتے ہیں ؟ اور نہ مرنے والے نے نہ مرنا ہے تو پھر صحت و تندرستی کے لئے کیوں احتیاطی تدابیر کرتے ہیں ؟ خوراک کے لئے کیوں کوشش کرتے ہیں ؟

اگر ان امور میں احتیاطی تدابیر کر لی جاتی ہیں اور کرنی بھی چاہییں ۔ نہ کرنے والا اپنے اوپر زیادتی کا مرتکب ہو گا پس خاندانی منصوبہ بندی بھی ایک کوشش و تدبیر ہے جو انسانی ہے جس میں کلی طور پر حسب منشاء نتائج و ثمرات کا نکلنا اور نہ نکلنا

ضروری نہیں ۔ انسان کا کام فقط تدبیر کر کے اللہ رب العزت کی ذات پر توکل کرنا ہے ۔ باقی اس کی جائز اور ناجائز صورتوں کیلئے میری کتاب خاندانی منصوبہ بندی اور ٹسٹ ٹیوب کی شرعی حیثیت ملاحظہ فرمائیں۔

غلبہ اسلام اور ظہور مہدی علیہ السلام کا صحیح تصور

ہماری اجتماعی اور انفرادی حالتِ زار یہ ہے کہ جب بھی کسی ترقی اور امر مہم کو سر کرنے کا وقت آتا ہے تو ہم یہ کہہ کر کنارہ کش ہو جاتے ہیں کہ اب ظہورِ امام مہدی علیہ السلام سے پہلے مسلمانوں کا ابھرنا ہی محال ہے ۔ تدبیر کیا چیز ہے اصل تقدیر ہے ۔ جب ہمارا مقدر ہی خراب ہے تو بھلا پھر وہ کیسے سیدھا ہو سکتا ہے ؟

یہ تو بجا ہے کہ ظہور مہدی علیہ السلام کے وقت اسلام کو عالمگیر رفعت و برتری حاصل ہوگی ۔ لیکن یہ بات غلط ہے کہ ظہور امام مہدی علیہ السلام سے پہلے مسلمان اپنے قوائے فکر و عمل کو معطل کر کے بیٹھ جائیں ۔ اور مایوسی کا شکار ہو کر اپنے ابھرنے کی کوشش ہی نہ کریں قرآن حکیم نے ایسے ہی غلط عقیدہ رکھنے والوں کو ببانگ دہل یہ نصیحت فرمائی ہے :

لاتسیئوا من روح اللہ انہ لاییئس من روح اللہ الا القوم الکافرین۔

"اللہ کی رحمت سے کسی مرحلہ پر مایوس نہ ہوں کہ مایوسی کفر ہے جو لوگ ایمان بالعمل و ایمان بالنتائج نہیں رکھتے فی الحقیقت وہی لوگ اللہ تعالی سے ناامید رہتے ہیں"۔

کوشش اور جدوجہد کرتے رہنا مسلمانوں پر ہر دور میں فرض ہے اور قربِ قیامت کی جو علامات بیان کی گئی ہیں ان کے بارے میں مسلمانوں کے اندر غلط رجحان نے جنم لیا ہے کہ فحاشی و عریانی کا پھیلنا قیامت کی علامات میں سے ہے ۔ لہذا اپنے آپ کی اصلاح منشا شریعت کے سراسر منافی ہے ۔ قربِ قیامت کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ قیامت اور میرے درمیان ایسا فاصلہ ہے جیسے دو انگلیوں میں یہ فرما کر ختم نبوت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ میرے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔

اسی طرح ۷۳ فرقوں کا ہونا بھی قیامت کی علامات میں سے ہے تو کیا پھر وحدتِ اسلامی کا کام نہیں کرنا چاہیئے ؟

قیامت کی علامات میں سے فحاشی و عریانی کی کثرت بھی ہے ان سب احادیث
سے انسان سے اختیار کی قوت سلب کرنا نہیں ہے بلکہ لوگوں کو آگاہ کرنا مقصود تھا۔
ز!! وحدت کو اختیار کرتے رہنا، فرقہ پرستی سے بچتے رہنا۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت کو کسی طریقے سے بھی کم نہیں کیا جا
۔ اہلِ حق کا کام غلبہ حق کی بحالی کے لئے کوشش کرتے رہنا ہے۔ ظاہری نتائج کی
ابی بھی ہو سکتی ہے اور اہلِ حق کو نصیب ہوتی رہی ہے۔ ماضی کی تاریخ اس حقیقت
اہ ہے۔

ظاہری نتائج جن کو فلسفہ نتیجہ خیزی کا نام دیا جاتا ہے یہ تب ممکن ہے جب امتِ
اجتماعی سطح پر غلبہ حق کی بحالی کے لئے متحد ہو کر کوشش کرے گی تو منزل و
امیابی قدم چومنے کے لئے تیار ہو گی اس کے لئے متحد ہو کر کوشش کرنا شرط ہے۔

فلسفہ نتیجہ خیزی کا عقل و شعور پر غالب آجانا بھی درست نہیں ہے کیونکہ اس
کر کی بنیاد بعض اوقات مادہ پرستانہ بھی ہو جاتی ہے لہذا ہم سب کو غلبہ حق کی بحالی کے
لئے سرگرم ہو کر کوشش و سعی کرتے رہنا چاہیئے اور ظاہری نتائج کے لئے اللہ تعالیٰ کے
حضور عرض کرنا چاہیئے کیونکہ وہی غالب حکمت والا ہے۔

باقی حضرت امام مہدی علیہ السلام کا ظہور فی الواقعہ ہونا ہے۔ اس پر امتِ
مسلمہ کا اتفاق ہے یہ ایک اجتماعی مسئلہ ہے لیکن وقت کا تقرر کرنا غلط ہے یہ سب کچھ
مخفی راز ہے۔ ہم سب کو ظہور اور آمد کا عقیدہ رکھنا چاہیئے اور غلبہ حق کی بحالی کے
لئے ڈٹ کر اور متحد ہو کر کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔

ظہور مہدی علیہ السلام کی وجہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت کو
کسی طریقے پر کم سمجھنا یا کرنا حماقت و ضلالت ہے۔

عروج و زوال کی حقیقت

سوال: عروج و زوال کی اصل حقیقت کیا ہے؟ وضاحت کیجئے۔

جواب: دنیا کے حالات سدا یکساں اور ایک جیسے نہیں رہتے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد
فرمایا:

وتلک الایام نداولھابین الناس
"ہم دنوں کو لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں"۔

حالات کا بدلتے رہنا انسانی Nature ہے ۔ کبھی غریب انسان امیر ہو جاتا ہے تو کبھی امیر آدمی ٹکڑے ٹکڑے کا محتاج ہو جاتا ہے ۔ کوئی آن کی آن میں عزت کھو بیٹھتا ہے تو کوئی ذلت و رسوائی کے گھڑوں سے نکل کر عظمت و کرامت کی مسند پر جا بیٹھتا ہے ۔ غرض اس طرح دنیا کا نظام چلتا رہتا ہے کسی چیز کو سکون و قرار حاصل نہیں دنیا ایک ڈھلتی چھاؤں ہے جو کبھی کسی کے پاس ہے اور کبھی کسی کے پاس عزت و ذلت اسی کے ہاتھ میں ہے ۔

اللھم مالک الملک توتي الملک من تشآء و تنزع الملک ممن تشآء و تعز من تشآء و تزل من تشآء بیدک الخیرہ انک علی کل شيء قدیر ۔ تولج الیل في النھار و تولج النھار في الیل و تخرج الحي من المیت و تخرج المیت من الحي ○

"اے پروردگار عالم! تو ہر چیز کا مالک ہے جسے چاہے حکومت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہے چھین لیتا ہے ۔ جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے ۔ سب خیر تیرے ہی ہاتھ میں ہے تو ہر چیز پر قادر ہے تو رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات میں بدل دیتا ہے ۔ زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے"۔

یہ سب تغیرات اور تبدیلیاں اللہ تعالیٰ کی غالب حکمت اور قدرت کی کارفرمائی پر دلالت کرتی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نظام کائنات کو سنبھالنے والا ہے وہ کسی کو ایک حالت پر نہیں رہنے دیتا ۔

مولائے کائنات علی المرتضیٰ فرماتے ہیں :

عرفت ربي بفسخ العزائم
"میں نے اپنے رب کو ارادوں کے ٹوٹنے سے ہی پایا ہے"۔

میں ارادہ کچھ کرتا ہوں لیکن ہوتا کچھ ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ارادوں کو بدلنے والی بھی کوئی طاقت ہے ۔ جس طرح اللہ تعالیٰ ارادوں کو بدلتا ہے اسی طرح کائنات اور مخلوقات کے حالات کو بھی بدلتا ہے ۔

گرمی کے بعد سردی اور سردی کے بعد گرمی ، خزاں کے بعد بہار اور بہار سے

خزاں، دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن یہ قانونِ قدرت ہے۔

عروج و زوال کے پس منظر کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔ عروج جہاں اللہ تعالیٰ کی نعمتِ عظمیٰ ہے وہیں پر اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر زوال بھی نعمت ہے۔ نیک متقی، پرہیزگار بندوں کے لئے زوال ابتلاء و آزمائش ہوا کرتا ہے تاکہ دیکھا جا سکے کہ ایسے بندے کیسے ہر حال میں خوش رہتے ہیں کیونکہ ترقی کے دور میں تو ہر آدمی خوش ہوتا ہی رہتا ہے لیکن تنزلی و زوال کے دور میں کم ہی لوگ شکر گزار ہوا کرتے ہیں۔

جب ساری دنیا گیت گاتی ہو، قصیدہ خواں ہو، بڑے بڑے پروٹوکول دیئے جائیں تو اس وقت کو عروج کہہ سکتے ہیں۔ اور جب ساری دنیا مخالفت پر اتر آئے تو یہ مخالفتیں و مزاحمتیں ظاہری نتائج میں رکاوٹ ہوتی ہیں۔ لہذا جہاں دین کی مخالفت کرنے والے ظلمت و تاریکی کے اتھاہ سمندر کی گہرائیوں میں گرتے ہیں تو وہاں پر اہلِ حق کی بھی آزمائش ہوتی ہے کہ وہ مضبوط و مستحکم رہیں۔ حق پر گامزن رہیں۔ اس لئے کہا گیا ہے:

الاستقامة فوق الكرامة۔ "استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے"۔

اہلِ حق کے لئے زوال یعنی ظاہری نتائج کا حسبِ خواہش سامنے نہ آنا آزمائش و ابتلاء ہے۔ ظاہری کامیابی جسے فلسفہ نتیجہ خیزی کہا جاتا ہے یہ اندازِ فکر غلط ہے۔ ظاہری نتائج کو عروج کا نام دیا بھی جا سکتا ہے اور نہیں بھی کیونکہ اہلِ حق کو شریعت نے صالح عمل پر مکلف ٹھہرایا ہے ظاہری نتائج پر نہیں۔ اہلِ حق کا کام کوشش کرنا ہے ظاہری نتائج کا سامنے آنا اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کوشش و سعی کا دنیا میں نتیجہ ضرور عطا کرتا ہے۔ لیکن اس فکر کو مایوسیت کا نام دینا انتہائی غلط ہے۔

جو اس فکر کو مایوسیت کا نام دیتے ہیں وہ اپنے آپ کا محاسبہ کریں کہ اب ہماری فکر کا کیا بنا۔

آراء و تاثرات

عالم باعمل حضرت العلامہ مولینا حافظ عبدالحلیم صاحب دامت برکاتہم العالیہ
مہتمم و ناظم اعلیٰ جامعہ انوار الاسلام غوثیہ رضویہ محلہ لائن پارک چکوال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم! اما بعد
عزیزم محمد عمر حیات الحسینی سلمہ بڑے باصلاحیت نوجوان ہیں ۔ ان کی
تصانیف منصہ مشہود پر آچکی ہیں اور صاحبانِ علم و فکر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی
۔ اللہ تعالیٰ نے بیک وقت زبان و بیان ، تحریر و تقریر کی خوبیوں سے نوازا ہے ۔
مزاجی ، ملنساری اور اخلاق و محبت میں اپنی مثال آپ ہیں ۔ علمی و تحقیقی و فکری
سے خدمتِ دینِ متین کر رہے ہیں ۔
عارف رومی کا یہ مصرعہ آپ کی جملہ خدمات کا آئینہ دار ہے ۔

کارِ مرداں روشنی و گرمی است

کتاب ھذا

"انسان اور مسئلہ تقدیر" کا مسودہ بعض مقامات سے دیکھا موضوع اپنی پیچیدگی
کے اعتبار سے منفرد ہونے کے باوجود محترم حسینی صاحب نے نہایت خوش اسلوبی ، عقلی
و نقلی دلائل و براہین سے اہل سنت کے اجتماعی عقیدہ "الامر بین الامرین" کو واضح فرمایا
ہے ۔ اندازِ استدلال محققانہ ہے ۔ موضوع پیچیدہ ہونے کے باوجود نہایت آسان ہو
گیا ہے ۔ اگر اسے قارئین غور و فکر سے پڑھ لیں تو مزید اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں
ہے۔
اس موضوع پر "کتاب ھذا" کے دلائل و شواہد اور مباحث سے ہٹ کر
کچھ کہنا افراط و تفریط ہو گا لہذا بین القدر والجبر اجتماعی عقیدہ ہے ۔ تقدیر کا مسئلہ
الٰہی ہے جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موضوعِ بحث بنانے سے منع
فرمایا ۔
اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا
فرمائے آمین

عزیزم محمد عمر حیات الحسینی سلمہ کو مزید خدمت دین نصیب فرمائے آمین اور یہ
تحریر نافع خلائق ہونے کے ساتھ ساتھ مصنف کے لئے ذخیرہ حسنات و نجات ہو۔

بحرمت سید المرسلین

والسلام عاجز

عبدالحلیم نقشبندی غفرلہ

۷-۴-۹۴

مہتمم و ناظم اعلیٰ جامعہ انوار الاسلام
چکوال

فاضل اجل خطیب اہلسنت حضرت العلامہ مولانا حافظ محمد ایاز احمد

صاحب چشتی

جامعہ اسلامیہ خیر المعاد قلعہ کہنہ قاسم باغ ملتان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد اللہ الذي خلق کل شيء بقدر و الصلوۃ علي نبیہ الانور الذي ارسل الي
الناس بالھدي و دین الحق الاظھر و علي و آلہ و صحبہ اجمعین۔

امابعد
خلاق کائنات کی تخلیق کا عظیم شاہکار انسان ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے علم
وفن، فہم و فراست اور قدرت مدرکہ کی خلعت فاخرہ سے نوزا ہے۔ اور اسے
کائنات میں تدبر و تفکر کرنے کا حکم دیا ہے۔ مسئلہ تقدیر ایمانیات کے باب میں
اہم ترین ہونے کے باوجود راز الٰہی ہے۔
اور ایک معمہ ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن بحث و مباحثہ
کرنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔
کیونکہ بحث مباحثہ کا نتیجہ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہوتا ہے اس وجہ
سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مسئلہ پر جھگڑا کرنے سے منع
فرمادیا۔

اس مسئلہ کی نسبت جہلائے عوام میں عجیب و غریب شکوک و شبہات پھیلا رکھے ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ و تعلق نہیں۔

برادر معظم علامہ محمد عمر حیات الحسینی صاحب زید مجدہ نے شب و روز کی محنت شاقہ اور جانفشانی سے مذکورہ مسئلہ سے متعلق نہایت حسن ترتیب کے ساتھ علمی، فکری، تحقیقی مواد جمع فرمایا ہے۔

میں نے انسانی زندگی میں قضاء و کردار کا کردار اور مسلک اعتدال کا مسودہ اکثر مقام سے بغور مطالعہ کیا ہے۔ جو اپنے موضوع پر اپنی مثال آپ ہے۔

قارئین پڑھنے کے بعد ہی اس کی جامعیت کے متعلق کچھ کہہ سکیں گے۔ کہ کس قدر ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے۔ اور ممکنہ خدشات و اشکالات کو رفع کیا گیا ہے۔ خیر و شر کی تخلیق منجانب اللہ ہے اور تخلیق مجبوری کا نام نہیں ہے۔

فاضل محترم جناب علامہ حسینی صاحب نے نہایت علمی و تحقیقی انداز میں افراط و تفریط سے ہٹ کر مسلک اہلسنت کے مطابق تمام اوہام و ساوس کی توضیح کی ہے جو کہ صاحبان علم کے لئے بالخصوص اور عوام الناس کے لئے بالعموم قابل قدر علمی و تحقیقی ذخیرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فاضل محترم کو نوجوانی میں بیشمار صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمل میں مزید برکتیں عطا فرمائیں۔ آمین اور ہم سب کو دین متین کی مزید خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ بصدقہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے مقاصد عظیم کو جلد از جلد کامیاب فرمائے۔ آمین۔ اور یہ تحریر ہم سب کے لئے نافع و اخروی نجات کا سبب ہو آمین ثم آمین۔

دعاگو

خادم العلماء و الطلباء

حافظ ایاز احمد چشتی غفرلہٗ

۲۱/۱۲/۹۳

خطیب لاثانی حضرت علامہ مولانا ریاض حسین جعفری صاحب

ڈائریکٹر ادارہ منہاج الصالحین ٹھوکر نیاز بیگ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کسی بھی زمانہ میں تحقیق کے دروازے بند نہیں ہوتے تمام فنون کے علماء کرام نے اپنے اپنے فن میں بحث و تمحیث کی ہے اور اپنے اپنے اختلافی نوٹ لکھے ہیں اور اختلاف امت کو رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رحمت فرمایا تھا تو اسی طرح علمائے کلام و فلسفہ کے درمیان بھی مسئلہ قضا و قدر کے موضوع پر اختلاف رہا ہے تقدیر مشکل اور لاینحل موضوع ہے اس اہم موضوع پر قدریہ جبریہ معتزلہ وغیرہ جادہ سے تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں بھٹکے ان کے باطل عقائد و نظریات سے مسلمانوں درمیان بھی شکوک و شبہات نے جنم لیا جن کا ہر دور میں علماء کرام نے قرآن و سنت روشنی میں جواب دیئے ہیں اور بھٹکی ہوئی مخلوق خدا کو صراط مستقیم دکھاتے رہے (ھدینٰہ السبیل اما شاکرا واما کفورا) مسئلہ قضا و قدر ایک اہم موضوع ہے جسکی مثال ایک پُل کی ہے جس کے دونوں اطراف افراط و تفریط سے ملتی ہیں۔

مولائے متقیان حضرت علیؑ فرماتے ہیں لاامرین الامرین " کہ معاملہ دو امروں درمیان ہے جیسا کہ آپ نے ایک سائل کے جواب میں ایک ٹانگ اٹھانے کا حکم دیا پھر آپ نے دوسری ٹانگ اٹھانے کا حکم دیا تو وہ عرض کرنے لگا مولا کیا یہ ممکن ہے؟ تو آپ نے فرمایا پہلی ٹانگ کا اٹھانا اختیاری ہے اور دوسری کا جبری ہے لہذا اس مسئلہ میں محتاط رہنا ضروری ہے ورنہ انسان ایمان و عمل سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے

اس علم کی طرف قرآن حکیم نے بڑی بلاغت سے وضاحت فرمائی ہے اگر صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو اس بات میں کوئی الجھن باقی نہیں رہتی

برادرم محترم علامہ محمد عمر حیات الحسینی سلمہ نے مسئلہ تقدیر کو نہایت اسلوبی سے قرآن و سنت کی روشنی میں سپرد قرطاس کیا ہے

الحمدللہ ہمارے برادرم سے دیرینہ تعلقات ہیں آپ نہایت ہی محنتی اور دماغ اسلام کے سپاہی ہیں آپ اسلام کی سربلندی کے لیے اسلام کے مورچہ کو مضبوطی تھامے ہوئے ہیں آپ اتحاد بین المسلمین کے داعی ہیں آپ کے دل و جان میں محبت

ت مچلتی رہتی ہے انشاءاللہ برادرم حسینی صاحب کی اتحاد امت کی جلتی ہوئی قندیل سے
دنیاانسانیت روشن ہوگی اور بھٹکی ہوئی قوم اپنی منزل پالے گی میری بارگاہ رب العزت میں
ہے کہ برادرم حسینی صاحب کے قلم میں بطفیل محمدؐ و آل محمدؐ زیادہ سے زیادہ زور عطا
ے آمین گدائے در بتولؑ ڈائریکٹر ادارہ منہاج الصالحین پاکستان
ریاض حسین جعفری 20 بی بلاک نواب ٹاؤن ٹھوکر نیاز بیگ لاہور

حضرت مولینا عبدالستار سمحانی صاحب

مدرس مرکز علوم اسلامیہ منصورہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلي علي رسوله الكريم امابعد

محترمی و مکرمی حسینی صاحب در مسئلہ تقدیر این رسالہ را بہ نہایت عرق ریزی و
ت ذہنی نوشتہ اند کہ درمعیار خود زیادہ و مانع میباشد کہ گویا این فشردہ مطولات میباشد کہ
ے عام و خاص فائدہ جامع دارد کہ بہ آسانی از شک و شبہات خود را نجات داہ میتواند چراکہ
تقدیر یک مسئلہ پیچیدہ است کہ اکثر مردم در وادی این گمراہ شدند از قبیل جبریہ و
معتزلہ و امثال ایشان از این جہت پیغمبرؐ از بحث و گفتگوی این مسئلہ منع فرمودہ بود
ث و گفتگوی ما اھل سنت و الجماعت درمقابل اضلال گروہ ضالہ میباشد تا اینکہ حقیقت
د و انکار تقدیر و صفات باری تعالیٰ لازم نیاید و این جائز بلکہ واجب است لذا برادرم
احب در فہرست خادمین این مسئولیت بہ شمار میروند خداوند کریم و رحیم در علم و
سینی صاحب برکت زیادہ عطا فرماید آمین ثم آمین یارب العالمین ۔ وبحرمت سید
ں

عبدالستار سمحانی

مدرس مرکز علوم اسلامیہ منصورہ لاہور

1/4/94

محمد عمر حیات الحسینی

کی

دیگر اہم تصانیف و تالیفات

1. مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی
2. قرآن حکیم کا جوہر اور خلاصہ
3. قرآن اور انسان
4. قرآن اور سائنس
5. خلاصۂ کائنات قرآن اور مقصدِ قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
6. سراج الضحیٰ فی فضائل المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
7. القول الجلی فی التوسل بالمصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
8. الفضل الموہبی لآل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
9. خاندانی منصوبہ بندی اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی شرعی حیثیت۔
10. اعضائے انسانی کی پیوندکاری کی شرعی حیثیت
11. انسان اور مسئلہ تقدیر
12. میڈیکل تعلیم کی اسلامی تشکیل
13. کیا اب اسلام کی ضرورت نہیں رہی؟
14. اسلام کا نظام قانون
15. اسلام کا نظام طلاق
16. اسلام کا نظام سیاست
17. اسلام کا نظام معیشت
18. جدید معاشی مسائل اور ان کا اسلامی حل
19. تاریخ امت (عروج و زوال کے تناظر میں)
20. اسلامی تحریکوں پر ایک نظر
21. تحریک منہاج القرآن عروج و زوال کے تناظر میں
22. احسن الفوائد فی شرح العقائد
23. اسلام کا نظام تعلیم و تربیت
24. اسلام کا نظام دعوت و تبلیغ
25. فقہی اختلافات کی اصل حقیقت
26. مسلکی اختلافی مسائل کی حقیقت اور اُن کا حل
27. شیعہ سنی اختلافات کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟
28. جدید و قدیم علوم کا باہمی ربط اور اسلام
29. اسلام کا قانونِ قصاص و دیت
30. احکام اسلامی عقل کی نظر میں۔
31. مقام حدیث اور منکرین حدیث کے انکار کے اسباب و محرکات
32. تقلید کی شرعی حیثیت
33. قیاس و اجتہاد پر ایک نظر
34. آنحضور بحیثیت معلم کائنات
35. آنحضور بحیثیت ماہر نفسیات
36. آنحضور بحیثیت پیکر حسن و جمال
37. رسوم و بدعات کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے
38. نوجوانوں کے نام اہم پیغام
39. تذکرۂ صحبت اہلِ دل
40. خانقاہی نظام پر ایک نظر
41. اسلام کی نظر میں عورت کا مقام و مرتبہ
42. سیرت محسن اسلام
43. حُبِ رسولؐ اور اُس کے تقاضے
44. حُبِ آلِ رسولؐ اور اُس کے تقاضے
45. حُبِ صحابہؓ اور اُس کے تقاضے
46. نالۂ دل
47. یادوں کے دیپ
48. اصلی مجرم کون؟

ملنے کا پتہ

- ملتان کتاب گھر چوک گھنٹہ گھر
- بیکن بکس گلگشت ملتان
- کاظمی کتب خانہ
- حاجی غلام نبی بخش کتب خانہ
- حاجی مشتاق کتب خانہ
- حاجی نیاز کتب خانہ اندرون بوہڑ گیٹ ملتان
- فاروقیہ کتب خانہ
- مجیدیہ کتب خانہ
- تالیفاتِ اشرفیہ
- بیرون بوہڑ گیٹ ملتان
- مکتبہ رضوان
- مکتبہ ضیاء القرآن
- مکتبہ القمر
- نوری کتب خانہ گنج بخش روڈ لاہور
- اسلامک پبلشنگ ہاؤس اردو بازار لاہور۔
- آستانہ عالیہ کاظمیہ سہروردیہ محمد پورہ شیخوپورہ
- آستانہ عالیہ قادریہ سہروردیہ مخدوم میر پد چکوال
- المرکز القادریہ بستی بوسن آباد ملتان